Multilingual & Multidisciplinary Peer Reviewed
Refereed Monthly Magzine from Qila-e-Golconda,
Hyderabad, Deccan

ISSN:- 2454-4035

انوار تحقیق

جلد سوم
جولائی - دسمبر 2017

شمارة: 12-6
القيمة: 50 روبية

Editor
سيد الياس احمد مدني

Address
9-10-380,-Neem Bowli Masjid, Machora House, Golconda Fort, Hyderabad,
Telangana 500008 -

Multilingual & Multidisciplinary Peer Reviewed
Refereed Monthly Magzine from Qila-e-Golconda,
Hyderabad, Deccan

ISSN:- 2454-4035

ANWAR-E-TAHQEEQ

Volume: Three
July-December 2017

Issue: 7-12
Price: Rs. 50/-

Editor
Syed Iliyas Ahmad Madni

Address
9-10-380,-Neem Bowli Masjid, Machora House, Golconda Fort, Hyderabad,
Telangana 500008 -

قلعہ گولکنڈہ،حیدرآباد،دکن سے ماہانہ ادبی مجلّہ..................(E-COPY)

انوار تحقیق

جلد۔۳ شمارہ۔۷تا ۱۲ جولائی تا دسمبر ۲۰۱۷ء

زرتعاون:۔فی شمارہ:۔۵۰روپئے سالانہ:۔۵۰۰روپئے

زرتعاون کا ذریعہ:
Mr. Mubarak Hussain
Accnt no.: 50045054076
IFSC CODE: ALLA-0210134
Allahabad Bank, AMU, Aligarh

نگراں:۔**پروفیسرعزیزبانو**، صدرشعبہ فارسی،مانو،حیدرآباد،تلنگانہ

ایڈیٹر:۔**سیدالیاس احمدمدنی**

پتہ:۔ 9/10/389،نیم باولی مسجد،کٹھوراہاؤس،گولکنڈہ قلعہ،حیدرآباد،تلنگانہ۔500 008

موبایل نمبر:۔09966647580 ای میل:۔anwaretahqeeq@gmail.com

مجلس ادارت

ڈاکٹرشاہدنوخیزاعظمی۔شعبۂ فارسی،مانوحیدرآباد

ڈاکٹرمحمدعقیل۔شعبہ فارسی،بی ایچ یو،وارانسی

ڈاکٹرصولت علی خان۔ڈائرکٹراے پی آرآئی ٹونک

ڈاکٹرمحمدقمرعالم۔شعبۂ فارسی،اےایم یو،علی گڑھ

محمدتوصیف خان کاکر۔شعبۂ فارسی،اےایم یو۔علی گڑھ

احمدنویدیاسرازلان حیدر

مدیرسہ ماہی ادبی جریدہ''دبیر''۔کاکوری،لکھنؤ

ارمان احمد

مدیرسہ ماہی ادبی جریدہ''عرفان''۔چھپرا،بہار

عاطفہ جمال

مدیرسالنامہ''کوکب ناہید''سندیلہ،ہردوئی

ڈاکٹرای اے حیدری۔صدرشعبۂ اردوگورنمنٹ لوہیا کالج چورو

متھی علی خان۔نامہ نگارروزنامہ منصف،حیدرآباد،دکن

عباس حیدرنقوی،رسرچ اسکالر،اےایم یو،علی گڑھ

مجلس مشاورت

پروفیسرمسعودانورعلوی۔شعبہ عربی اےایم یو،علی گڑھ

پروفیسرعمرکمال الدین۔شعبۂ فارسی،لکھنؤیونیورسٹی،لکھنؤ

پروفیسرسیدحسن عباس۔شعبۂ فارسی،بی ایچ یو،وارانسی

پروفیسرسیدمحمداسدعلی خورشید۔صدرشعبہ فارسی،اےایم یو،علی گڑھ

پی انورادھاریڈی۔انٹیک،تلنگانہ اسٹیٹ،حیدرآباد۔چاپٹر

ڈاکٹرزرینہ پروین۔ڈائرکٹرآف آرکائیوز،حیدرآباد،دکن

ڈاکٹرسیدمحمداصغرعابدی،شعبہ فارسی،اےایم یو،علی گڑھ

احمدعلی،کیپرمینسکرپٹ۔سالارجنگ میوزیم،حیدرآباد

ڈاکٹرسیدہ عصمت جہاں۔شعبۂ فارسی،مانوحیدرآباد

ڈاکٹرایم اےنعیم،حیدرآباد،دکن

جناب ایم اےغفار،استادخطاطی،ادارۂ ادبیات اردوحیدرآباد

کشورجھن جھن والا،ماہرمسکوکات،ممبئی

امربیرسنگھ۔ماہرمسکوکات۔حیدرآباد

فہرست مندرجات

	عنوان	زبان	مقالہ نگار	صفحہ
۱۔	ضیاءِتصوف			۳
۲۔	رہبرانقلاب اسلامی آیۃ اللہ خمینیؒ	(اردو)	صاحبزادہ ڈاکٹرصولت علی خان	۴
۳۔	ہندوستان میں جدید اردو مرثیہ کا سماجیاتی مطالعہ		ڈاکٹرای۔اے۔حیدری	۷
۴۔	غضنفر کے افسانے ’خالی فریم‘ کا تجزیہ		ڈاکٹرثروت النساء	۳۸
۵۔	جنگ یوروپ		ڈاکٹرارشدسراج	۴۴
۶۔	راجستھان کی ہم عصر اردو غزل ایک مطالعہ		ڈاکٹراسماءمسعود	۴۶
۷۔	محمد خالد عابدی: ایک ہمہ جہت اور عہد آفریں شخصیت		ڈاکٹرمعین الدین شاہین	۵۳

ضیاءِ تصوف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب علامہ ابواللیث رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ساتویں آسمان پر اللہ کے ایسے فرشتے ہیں کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے جب سے پیدا کیا ہے برابر سجدے میں ہیں اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے انتہائی خوف زدہ ہیں قیامت کے دن جب وہ سجدے سے سر اٹھائیں گے تو کہیں گے 'اے اللہ تو پاک ہے ہم تیری کما حقہ عبادت نہیں کر سکے'

'فرمان الٰہی وہ فرشتے اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور جس چیز کا انھیں حکم دیا گیا ہے وہی کرتے ہیں اور ایک لمحہ بھی میری نافرمانی میں نہیں گذارتے'۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

'جب کوئی بندہ خوف الٰہی سے کانپتا ہے تو اس کے گناہ اس کے بدن سے ایسے جھڑ جاتے ہیں جیسے درخت کو ہلانے سے اس کے پتے جھڑ جاتے ہیں'۔

(مکاشفۃ القلوب اردو حجۃ الاسلام امام محمد الغزالی قدس سرہ العزیز)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بدان کہ در اصطلاح صوفیائے کرام و در بیان متعارف ایشان میخانہ وخمخانہ وشراب خانہَ باطن عارف کامل را گویند کہ در معارف شوق وحقائق الٰہی محو ومدہوش بسیار باشد

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔

صوفیائے کرام کی اصطلاح اور ان کے بیان متعارف کے بارے میں جانئے۔ میخانہ، میکدہ، خم خانہ اور شراب خانہ ایسے عارف کامل کے باطن کو کہتے ہیں جو معارف شوق وحقائق الٰہی میں بہت زیادہ محو ومدہوش ہوں۔

(رسالہ اصطلاح صوفیائے کرام' مخطوطہ فارسی' تصحیح وترجمہ صاحبزادہ ڈاکٹر صولت علی خان)

رہبر انقلاب اسلامی آیۃ اللہ خمینیؒ

صاحبزادہ ڈاکٹرصولت علی خان

ڈائرکٹراے پی آر آئی ٹونک

آنکھوں میں اشکہائے عقیدت، دل میں حزن و ملال کا طوفان اور لب پر شرر بار آہ و بکا سامان حشر بپا کئے ہوئے ہیں۔ایک حشر بپا ہے اور ایک حشر کا پیش خیمہ ہے جوحشر برپا ہو چکا ہے اس کا سب کو پتہ ہے جوحشر بپا ہونا ہے اس کا مکمل اندازہ کسی کو بھی نہیں ہے۔نہ آنکھ کے آنسو جانیں نہ دل کے تقاضے، نہ ٹوٹے تارے جانیں نہ میخانے کے ساغر، نہ انجم و کہکشاں جانیں نہ خانماں برباد پروانے۔ایک نابغہ کی موت جوطبعی ہوتے ہوئے بھی ایک قیامت عظمٰی سے کم نہیں۔

موت العالم موت العالَم کے مصداق حضرت امام خمینیؒ کی موت ایک عالم کی موت ہے لیکن یہ موت موت نہیں ایک انقلاب، ایک درس، ایک تحریک اور ایک دعوت ہے۔اس موت میں ایک زندگی مضمر ہے، دائمی اور ابدی زندگی، اس موت کا کیا کہنا جوخود ایک دائمی اور ابدی زندگی ہو جائے۔ کائنات کے عوام کی زندگی موت ہوا کرتی ہے لیکن شاذ و نادر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی نابغہ کی موت بھی زندگی ہو جاتی ہے امام خمینی ایک ایسی ہی نابغۂ روزگار شخصیت تھی جن کی موت بھی زندگی ہے۔ان کی زندگی مکمل ایک تحریک تھی ایک انقلاب تھی اسی لئے زندگی حیات جاوید بن گئی ہے۔

امام خمینیؒ کی زندگی بھی مستقل جہاد تھی آج ان کی موت بھی مستقل جہاد وتبلیغ اسلام ہے۔موت نے ان کو ہم سے چھڑانا چاہا لیکن وہ ہم سے اور قریب ہو گئے۔دلوں کی دھڑکنیں بن کر، حرارت عزیزی بن کے، انفاس کی گرمئ رفتار بن کے، ایمان وایقان کا نور بن کر، زندگی کا شعار بن کر، فکر وعمل کا انداز واسلوب بن کر، طلوع سحر کا نور ایمان بن کر اور دعوت جہاد کا معیار بن کر وہ آئے۔نور سحر بن کر طمانیت خورشید عالم بن کر جیئے تو راہ رو منزل مقصود بن کر گئے، معراج تجلیات بن کر آئے تو جرس کارواں بن کر گئے۔وہ میر کارواں ہو کر ایسے نہیں گئے کہ سب کچھ اپنے ساتھ لے گئے ہوں وہ اس طرح گئے کہ بہت کچھ دے گئے اور اتنا کچھ دے گئے کہ صدیاں ان سے پلتی رہیں گی قرنہا قرن ان سے زندہ رہیں گے اور تاریخ کے دل بادل ذخائر ان میں گم ہو جائیں گے وہ ان میں گم نہیں ہوں گے اس لئے کہ وہ مرکر بھی زندہ ہیں۔روح اللہ بن کر قوت اللہ بن کر، نور ایمانی بن کر، ناز یزدانی بن کر، نور سبحانی بن کر، یداللّٰہی قوت بن کر، اخلاق محمدی بن کر، زور حیدری بن کر، نمونۂ خلق حسنی وحسینی بن کر زندۂ جاوید رہیں گے بقول حافظؔ شیرازی

ہرگز نمیرد آن کہ دلش زندہ شد بہ عشق	ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما

وہ ایسی زندگی اور حیات ابدی لئے ہوئے ایک پیام و یمان وعمل ہوا کرتی ہے۔ان کی موت بھی زندگی تھی لیکن ابدی زندگی جس کی زندگی میں عالموں کی زندگیاں مضمر ہوں اور عالموں کی زندگیوں میں آئندہ قرنوں اور زمانوں کی زندگیاں وابستہ ہوں اس لئے کہ وہ ایک منفرد دور سے وابستہ ہی نہیں تھے ایک دور کے پروردہ اور دوسرے دور کے خالق تھے۔جس دور کے وہ پروردہ تھے وہ دور ضرور ختم ہو گیا لیکن جس دور کے وہ خالق تھے وہ دور تو ان کی موت سے ہی شروع ہوا ہے [1]

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

ابھی ایک اور انقلاب باقی ہے ابھی اور منزل نظر کے سامنے ہے ابھی قیادت کے مرحلے باقی ہیں ابھی تاریخ کے اوراق مزین ہونا باقی ہیں ابھی اور

دعوت فکر و عمل اور تبلیغ اسلام کے امتحان باقی ہیں۔

فرید الدہر، وحید العصر، علامۃ الدہر، امام خمینی عالم اسلام کے ایک ایسے شاہکار تھے جس کو موت نے اور بھی لازوال بنادیا، وہ بیسویں صدی کے سب سے عظیم المرتبت رہنما اور عالم اسلام کے صرف ایک مرد مومن اور مرد مجاہد تھے، جس کا کردار نور سبحانی کا آئینہ، جس کا سینہ گنجینۂ اسرار کا آبگینہ، جس کا چہرہ مصحف قرآنی کا نمونہ، جس کا عمل طاقت یزدانی اور قوت حیدری کا خزینہ تھا۔ جس کی پیشانی کی شکنیں، تاریخ عالم کی بدلتی ہوئی شکلیں تھیں۔ جس کی بدلی ہوئی نظر میں انقلاب در انقلاب کی ابھری ہوئی نظریں تھیں۔ جس کی آواز دعوت تبلیغ اور جس کی ایک للکار یلغار و پیکار تھی جس کے انفاس میں اعداء و اغیار کے لئے 'لاقوۃ الا قوۃ اللہ' 'لافتیٰ الا علی لاسیف الا ذوالفقار' اور جس کے قول و فعل میں عمل قرآنی کی طاقت دستار فضیلت بنی ہوئی تھی جس کے دور میں اور دور نگاہ گرہ گیر میں انقلاب کی پہنائیاں سمٹی ہوئی تھی جس کے دل میں مقاومتی زور کے مدو جزر موجزن ہوں، جس کی کروٹوں میں انقلاب در انقلاب مضمر ہوں جس کے انداز تخاطب میں قیامت کی طاقت ہو جس کی آواز میں دل بستگی کے سامان ہوں جس کے دست و بازو میں تعمیر و تدبیر و جہاد کے حشر سامانی نقشے ہوں اور جن کی فکر و فہم میں تسخیر و تقدیر و تعمیر کی جوہری صلاحیتیں ہوں جس کے دل میں چشم تصور جان جانان کے جلوے ہوں جس کے سینے میں آیات سکینہ کے نمونے ہوں جس کے لب پر لا الہ کے ذکر خفی و جلی کے انوار سحر ہنگام ہوں اور جس کی زبان رطب اللسان ہو آیات قرآنی میں ایسا مرد مومن اور ایسا مرد مجاہد کبھی نہیں مرتا وہ مر کے بھی زندہ رہتا ہے اپنے فکر و عمل میں، نطق و گویائی میں فکر و فہم میں دعوت تعلیم اور قوت طاقت ایمانی میں۔

اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو ایسا مرد مومن اور مرد آہن اور مرد مجاہد نہ پیدا ہوا اور نہ پیدا ہونے کے آثار، اگر آثار ہویدا ہیں تو امام خمینی کے لائحۂ عمل میں، دعوت فکر و عمل میں، اقوال زریں میں، اعمال حسینی میں، جمال رنگیں میں، جلال ناصری میں،، امام خمینی کا کردار پورے عالم میں کردار آفریں تھا جس کا نہ کوئی ہمسر تھا نہ ہوگا۔

ایسا فقیہ و امیر و فقیر جو دلوں پر راج کرتا ہوا ایسا تاجور جس کا تاج خود اس کی دستار فضیلت ہو۔ جس کا تخت خود اس کی مسند رشاد ہو، جس کی حکومت خود اس کی سیادت ہو، جس کی زمام حکومت اس کی امانت ہو اور جس کی حکمت عملی خود اس کی ثقاہت ہو، جس کے منصوبے خود اس کے عمل پیہم کے نمونے ہوں جس کی آواز قول فیصل ہو، جس کے انداز فکر میں شان امارت ہویدا ہو، جس کی حکومت کے اصول قرآنی ہوں۔ جس قرآن و حدیث کے انوار قرون و عہد کی تاریخ میں ایسا بے تاج کا امیر کشور گیر اور اقلیم امارت و سیادت کا ایسا عالم گیر کردار کہیں نہیں ملے گا جو بے تاج و تخت عالم کا لازوال کردار ہوا اور دنیائے اسلام کا ناقابل فراموش آفاقی امیر و فقیر ہو۔ جو زندہ رہا تو غیر متزلزل طاقت بن کر اور مرا تو لافانی کردار بن کر، جس میں زندگی کا پیام نو بھی ہے اور حیات و ممات کا فلسفۂ جلالت شاہی بھی اور فکر و عمل اور دعوت تعلیم کا منصوبۂ فضیلت مآبی بھی۔

آج امام خمینی کی موت سے زندگی کے رشتے ٹوٹتے دکھائی دے رہے ہیں لیکن انسانیت واخوت، صداقت و جلالت، صلابت و نجابت کے رشتے اس استحکام سے جڑتے نظر آرہے ہیں کہ امام خمینی ہی عالم اسلام میں آج کا تو رہنما ہے ہی کل کا بھی وہی رہنما و قائد و امیر نظر آرہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امام خمینی کو نہ اشکبار عقیدت زندہ کر سکتے ہیں اور نہ دل کے تقاضے ان کو لا سکتے ہیں نہ قلب محزوں کی آہ و بکا ان کو ہلا سکتے ہیں اور نہ ہی مضطرب و حیران و پریشان نظریں ان کی دوبارہ زیارت کر سکتی ہیں لیکن ان کا درس ان کا پیغام ان کا کردار ہمیشہ جمال و جلال خمینی بناز زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

ان کی زندگی نے جو عالم پیدا کیا تھا موت نے اس کو تو اور سنوار دیا لیکن ہمارے لئے ایک ایک قیامت صغریٰ کا منظر بپا کر دیا ہے۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کر کے اب وہ چلے تو گئے لیکن ہمیں محزون و مہجور و غم نصیب اور حرماں نصیب کر کے ایک عالم سوگوار غم گسار ہے ایک عالم دگرگوں ہے ایک حشر بپا

عالم ہے جس سے عالم میں غم والم، ہجر وفراق، آہ و بکا اور اندوہ ورنج وملال چھائے ہوئے ہیں اور وہ امام زماں ہمارے اندوہ گیں دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں ایسے فقیر و مجتہد و مجاہد کی موت واقعی صبر آزما ہے۔ ایران ہی سوگوار نہیں سارا عالم اسلام سوگوار ہے ان کے جانے سے ہم بے سکت ہو گئے ہیں ایک عالم ختم ہو گیا دوسرا عالم زندہ ہو رہا ہے اس عالم میں اپنی تقدیر کا ماتم کریں کہ نئے عالم کے شروع ہونے کا عزم بالجزم کریں ایک عالمی کردار ہزاروں کردار لئے چل بسا لیکن ایک نیا عالم دے کر ایک نئی دنیا دے کر نیا درس دے کر، نیا پیام دے کر لازوال بننے کا نسخۂ کیمیاء اثر دے گیا۔

ہم اپنے محزوں دلوں سے اپنے تمام ایرانی بھائیوں کے عالم بپا اور حشر ساماں غم میں برابر کے شریک ہیں اور امام صاحب کی موت کو ایک عالمی سانحہ ہی تصور نہیں کرتے بلکہ عالم اسلام کا نا قابل تلافی ایسا حادثہ تصور کرتے ہیں جس میں صدیاں جڑی ہوئی ہیں اور صدیاں ماتم کرتی رہیں گی لیکن اس سے ایک دائمی درس بھی لیتی رہیں گی۔

☆☆☆☆☆

ہندوستان میں جدید اردو مرثیہ کا سماجیاتی مطالعہ

ڈاکٹر ای۔اے۔حیدری

لوہیا کالج، چورو

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اردو زبان و ادب پر ایران، عرب اور ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و تمدن کے اثرات نہایت گہرے ہیں۔ ہندوستان میں سینٹرل اور دکنی ایشیاء سے جو افراد آئے وہ ترک، ایرانی یا مغل تھے ان میں کچھ سیر و سیاحت، کچھ تلاش روزگار، کچھ تجارت اور کچھ تبلیغ دین کے لئے آئے تھے اور ان سب کو ایک قابل فہم اور عام رابطے کی زبان کی حاجت تھی انہی سماجی عوامل و محرکات کے نتیجے میں اردو زبان وجود میں آئی اور بازاروں، خانقاہوں، کھیل کود کے میدانوں میں بولی اور سمجھی جانے لگی، جسے علماء فضلا اور بزرگان دین نے علم و ادب کی ترویج و اشاعت اور اخلاقی تربیت کے لئے استعمال کیا۔ اس کی ترویج و اشاعت میں مندرجہ بالا افراد کے دوش بدوش دکن کے شاہی درباروں کی بڑی اہمیت ہے جہاں شعراء و ادباء کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی و پذیرائی ہوئی۔

مجموعۂ افراد کا نام سماج ہے، اور زبان و سماج کا رشتہ روح و جسم کا سا ہے۔ جب زبان اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہے تو اس میں تہذیب و ثقافت سے متعلق افکار و نظریات اور ادبی و شعری تخلیقات کے لئے امکانات کے در کشادہ ہوتے ہیں اسی لئے تخلیقی عمل کو ایک ذاتی اور انفرادی عمل قرار دینا درست نہیں کیوں کہ اس میں خارجی عوامل و محرکات کی کارفرمائی بھی شامل ہوتی ہے۔ داستان ہو یا ناول، شاعری ہو یا افسانہ، ہر صنف ادب میں سماج و معاشرے کی گوناگوں کیفیات کا عکس جھلکتا ہے۔

سماجیات کا علم حیات انسانی کے جملہ شعبوں کو محیط ہے اور یہ زندگی کے تمام متنوع پہلوؤں کو اپنے دائرۂ کار میں لاتا ہے اور جو کچھ بھی سماج میں رونما ہوتا ہے اس کا اثر انسان اور اس کی زندگی پر جس طرح مرتب ہوتا ہے اسے اپنی بحث و تمحیص کا مرکز و محور قرار دیتا ہے، کبھی کبھی ایک شخص یا مختلف اشخاص کی جدوجہد سے سماجی نظم و نسق میں انقلاب کا عمل رونما ہوتا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ سماجی حقائق انسانی زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔ ایک بچہ دھیرے دھیرے ان تمام باتوں کو اختیار کرتا ہے جو اسے معاشرے میں دکھائی دیتی ہیں اور رفتہ رفتہ معاشرے کے مطالبات سے اپنی فہم و فکر کے اعتبار سے واقف ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ ارتقائی مراحل میں سماجی عوامل و محرکات سے متاثر ہوتا ہے۔

سماجیات کے فلسفہ کا تعمیری رخ یہ ہے کہ اس کے ذریعے ہمیں اچھا انسان اور اچھا شہری بننے میں مدد ملتی ہے اور بے شمار سماجی مسائل کو حل کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے سماج کے مقاصد عام ہوتے ہیں سماج منظّم ہوتا ہے۔

سماج مختلف افراد پر مشتمل ایسے گروہ سے عبارت ہے جو کسی خاص جگہ رہتا ہے اور جس میں یک جہتی و ہم آہنگی موجود ہو۔ کسی بھی سماج کے لئے یہ لازمی نہیں کہ اس کے تمام افراد ایک ہی مذہب، ایک ہی ذات یا نسل سے متعلق ہوں۔ سماجیاتی فلسفہ کے اعتبار سے یہ اسی وقت وجود میں آتا ہے جب کسی جگہ رہنے والے تمام افراد باہمی تعاون پر عمل پیرا ہوں اور ان میں ہم آہنگی موجود ہو۔ اگر ہم سماج کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح ہم پر عیاں ہوگی کہ سماج درجوں اور طبقوں میں بٹا ہوا ہے الگ الگ سماج میں اس طبقاتی تقسیم کے معیار الگ الگ ہوتے ہیں اور ہر سماج کے الگ الگ آداب ہوتے ہیں جنہیں سماجی ضابطہ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ سماج کے افراد پر ایک طرح کی بندش عائد کرتا ہے اور جو فرد ان بندشوں سے انحراف و انکار کرتا ہے اسے معاشرہ یا سماج نظر استحسان سے نہیں دیکھتا۔ اس طرح سماجی ضابطوں کو قبول کرنے کے سبب سماج کے افراد میں یک جہتی و ہم آہنگی فروغ

پاتی ہے۔

مذہب کا تصور الوہی طاقت کے تصور کے علاوہ انسان کی سماجی ومعاشرتی زندگی سے بھی مربوط ہے۔اس کے علاوہ سماج کا ہر طبقہ اور ہر مذہب اپنے ماننے والوں کے لئے کچھ اصول وقوانین وضع کرتا ہے جسے ضابطۂ اخلاق کہتے ہیں اور دنیا کے کسی بھی سماج یا مذہب میں قوانین شکنی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔اکثر سماج ومذاہب ایسے افراد کو لائق تعذیر بھی سمجھتے ہیں۔

انسان سماج کی ایک فرد ہے اس لئے ادیب وشاعر کو حیات انسانی،افعال وحرکات انسانی کے علاوہ اس کے جذبات ومحسوسات سے دلچسپی ہوتی ہے اور اس کے تخلیق کردہ ادب میں زندگی کا عکس نظر آتا ہے مختصر یہ کہ حیات وکائنات کا ہر پہلو ادب کا موضوع بن سکتا ہے۔ادب ایک ایسی دستاویز ہے جس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو انسان کے مشاہدے کا حصہ بن چکا ہے حقیقت یہ ہے کہ ادب زندگی کی تنقید،تفسیر اور زندگی پر طنز سبھی کچھ ہے

ہندوستان میں انگریزوں کی عمل داری سے قبل فارسی کا بول بالا تھا مگر اپنے ہم وطنوں سے اختلاط وارتباط کے سبب ہندی بھی منظور نظر تھی۔یہی سبب ہے کہ ہمارے قدیم ادب میں فارسی الفاظ وتراکیب کے ساتھ ہندی الفاظ وتراکیب کی آمیزش وافر مقدار میں نظر آتی ہے۔اگر ہم اردو ادب کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ پہلو ابھر کر سامنے آئے گا کہ اردو کے ابتدائی سربرآوردہ شاعروں نے فارسی کے اثرات قبول کرنے کے ساتھ ساتھ ہندی اثرات بھی قبول کئے۔

ادب کی قدیم ترین صنف مرثیہ ہے اس لئے کہ احساس رنج وغم کی شدت میں اشک وآہ کا اظہار عین فطرت بشری ہے لہٰذا جتنی قدیم انسانی وجود کی تاریخ ہے اتنی ہی قدیم تاریخ مرثیہ ہے قدامت مرثیہ کا اعتراف کرتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ

'عربی میں،جو فارسی اور اردو شاعری کا سرچشمہ ہے شاعری کی ابتداء مرثیئے سے ہوئی'۔

عربی وفارسی دونوں زبانوں کے ادب میں مرثیئے کی روایت موجود ہے جس کی اپنی تاریخی اہمیت ہے لیکن اردو مرثیہ اس سے قطعاً مختلف ہے اس لئے کہ ہمارے ادب میں مرثیہ کا اطلاق زیادہ تر شہدائے کربلا اور بالخصوص سیدالشہداء حضرت امام حسینؑ کے مرثیئے پر ہوتا ہے۔اردو میں مرثیہ گوئی کی ابتداء اولاً اسی اصول کے تحت ہوئی تھی یعنی شہدائے کربلا اور امام مظلومؑ کی شہادت کو یاد کر کے غم والم کا اظہار کرنا اور دوسروں کو مغموم ومحزون کرنا،چنانچہ ابتداء میں جو مرثیئے کہے گئے وہ بیس تیس بیت سے زیادہ کے نہ ہوتے تھے اور ان میں مرثیت اور بین کے علاوہ اور کوئی مضمون نہیں ہوتا تھا مگر اس کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا لہٰذا شعرائے متاخرین کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں تھا کہ اس میں جدت وندرت پیدا کریں اور مرثیہ کے حصار کو توڑ کر اس کے موضوعات ومضامین میں اضافہ کریں لہٰذا بعد کے مرثیہ نگار شعراء نے اس حصار کو توڑا اور اردو مرثیئے کے موضوعات ومضامین میں اس قدر اضافہ کیا کہ اردو مرثیہ دیگر اصناف سخن سے بہتر محسوس ہونے لگا لیکن اس کا رشتہ اسی سرزمین سے استوار رہا جس میں اردو زبان پیدا ہوئی اور پھلی پھولی تھی اردو میں مرثیہ گوئی کا آغاز حصول ثواب اور مجلسوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ہوا تھا اس لئے ابتدائی مرثیہ نگاروں نے حصول ثواب،سامعین اور مجلسوں کی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے مرثیہ کہے جس کے سبب ان کی مکمل توجہ بینیہ حصہ پر مرکوز رہی مگر بعد کے بیش تر مرثیوں میں بیک وقت سماجی،سیاسی معاشی اور تہذیبی صورت حال کی عکاسی نظر آتی ہے اردو مرثیئے منظر نگاری،مکالمہ نگاری،کردار نگاری،رزم نگاری،واقعہ نگاری اور پیکر تراشی وغیرہ کا بہترین نمونہ ہیں۔

دکن کے مختلف درباروں اور شمالی ہند میں دلی اور اس کے بعد اودھ میں اردو مرثیئے نے ارتقا کی جن منزلوں کو طے کیا اس کی تفصیل سے صرف

نظر کرتے ہوئے یہ عرض کرنا ہے کہ قدیم مرثیہ کو مرثیہ نگار شعراء بالخصوص انیسؔ و دبیرؔ وغیرہ نے جس معراج کمال پر پہنچادیا تھا اس سے آگے لے جانا، روایت کے حصار سے آزاد کرانا اور نئی راہوں سے آشنا کرانا آسان کام نہ تھا۔ جس وقت مرزا محمد جعفر اوجؔ نے مرزا دبیر کی مسند سنبھالی اس وقت اردو مرثیہ میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ اور عشقؔ و تعشقؔ کی روایت کے حصار میں مقید تھا، حالاں کہ زمانہ بدل چکا تھا۔ مرثیہ گو شاعر اس صورت حال سے پوری طرح متأثر تھا مگر نبرد آزمائی کے بجائے ساقی نامے اور بہاریہ عناصر سے اپنے غم کو کم کرنے میں مصروف تھا۔ اوج کا مزاج اس روش کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا اس لئے اوجؔ نے خالص علمی، فکری اور فلسفیانہ مضامین کے لئے مرثیہ کا دروازہ وا کیا اور درس اخلاق کے ذریعے مرثیے میں سماجی تنقید کو راہ دی اور اپنے عہد کے بعض سماجی، علمی، اخلاقی، معاشرتی اور معاشی مسائل کا تذکرہ کیا، طلبہ کی تعلیم سے عدم دل چسپی اور ذمہ داریوں سے لاپرواہی، بے عمل حامیان دین کی حالت، علماء، شعراء اور ذاکرین کی صورت حال پر اوج نے بے خوف انداز میں تبصرہ کیا ملاحظہ ہو طلبہ کے اخلاقی و روحانی انحطاط کی ایک جھلک:

ہے جاہلوں کا تو کیا ذکر علم کے طلباء　　　کہ پڑھنے لکھنے کا رہتا ہے جن کو شغل سدا
ہے جن سے مسجدوں کی زیب و زین نام خدا　　　ہے خانقاہ و مدارس کے دل میں جن کی جا
نہ جانے کیسی وہاں تربیت یہ پاتے ہیں
سند وفور جہالت کی لے کے آتے ہیں

ذیل کے بند میں علماء کی صورت حال بھی ملاحظہ ہو۔

یہ جس کے پاس فنس پر سوار ہو کے گئے　　　کبھی نہ اترے وہ جب تک قدم نہ آکے لے
ہر ایک بات اس آہستگی کے ساتھ جسے　　　ہے دوسرے کا کیا ذکر خود نہیں سنتے
جو کوئی زور سے بولا تو غیظ جاری ہے
عبث غریب پہ فتوی ٔ کفر جاری ہے

اوج نے جب یہ دیکھا کہ قوم ذکر حسین کے عوض نجات کے تصور سے غلط فائدہ اٹھا رہی ہے تو انہوں نے اس تصور کے بے مایہ ہونے کا بھی اعلان کر دیا:

ہم سب اے کاش جہنم ہی میں جاتے مولا　　　پر نہ یہ داغ جگر آپ اٹھاتے مولا
امن عصیاں سے نہ ہم حشر میں پاتے مولا　　　آپ غربت میں مگر سر نہ کٹاتے مولا
ہجر صغریٰ کا نہ داغِ علی اصغر سہتے
چین سے گھر میں سدا قبلۂ عالم رہتے

حیف اس وقت ہوئے کیوں نہ ہم اے شاہِ کریم　　　جوش دل اب یہی کہتا ہے خدا اس کا علیم
نہ خلش اس میں رجاء کی ہے نہ آمیزش بیم　　　نہ پئے دوریٔ دوزخ نہ پئے فوز عظیم
جب تو قاصر رہے پر آج نہیں قاصر ہیں
آپ کے دشمنوں سے لڑنے کو ہم حاضر ہیں

اس طرح مرزا اوؔج نے جدید مرثیہ نگاری کے سفر کو نہایت برق رفتاری کے ساتھ طے کیا۔ انھوں نے عزائے امام حسین کو محض مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ انسانی حمیت وغیرت کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج جدید مرثیے میں جو اہم اور توانا سیاسی، سماجی اور فکری میلانات نظر آرہے ہیں ان کا منبع مرزا اوؔج کا ہی کلام ہے۔

مرزا اوؔج کے معاصرین میں شادؔ عظیم آبادی، دلورام کوثرؔی، ناظر حسین ناظمؔ اور حامدؔ جون پوری وغیرہ نے بہاریہ مضامین، ساقی نامے اور منظر نگاری کی جگہ حیات وکائنات کے اہم مسائل کے تجزیئے اور تقابل کو راہ دی اور اپنے مراثی میں مقصد، فلسفہ، اور واقعۂ کربلا کے سیاسی، سماجی، معاشرتی اور اخلاقی اثرات کو پیش کرکے صحت مند سماج ومعاشرہ کی تشکیل میں اہم خدمت انجام دی۔

جدید مرثیہ کی تاریخ میں جوشؔ ملیح آبادی کے اجتہادات کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں، ۱۹۲۰ء میں انہوں نے اپنا پہلا مرثیہ آوازہ حق کہا اس میں جوشؔ نے آزادی وانقلاب کے تصورات کو واقعۂ کربلا کے حوالے سے پیش کیا اور 'تازہ کربلا' اور 'عزم حسین' کے تصور کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ جوشؔ نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کے لئے ہندوستانی سماج میں عزم واستقلال، جرأت اظہار اور ظالم حکومت سے ٹکرانے کا جوش وولولہ پیدا کرنے کے لئے تاریخ اسلام سے امام حسین کی شخصیت کو منتخب کیا اور آوازۂ حق کے بعد حسین وانقلاب لکھا۔ انہوں نے ہلال نقوی کو دیئے اپنے انٹرویو میں جدید مرثیے کا مقصد ہمت تازہ کرنا، باطل سے لڑنے کا ولولہ پیدا کرنا اور سامعین کو رلانے کے بجائے جگا کر اٹھانا قرار دیا ہے اور ان کے یہ نظریات ان کے اکثر مراثی میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ آوازۂ حق کا یہ بند دیکھئے:

اے قوم وہی پھر ہے تباہی کا زمانہ | اسلام ہے پھر تیرِ حوادث کا نشانہ
کیوں چپ ہے اسی شان سے پھر چھیڑ ترانہ | تاریخ میں رہ جائے گا مردوں کا فسانہ

مٹتے ہوئے اسلام کا پھر نام جلی ہو
لازم ہے کہ ہر فرد حسینؑ ابن علیؑ ہو

جوشؔ نے عصری مسائل، فکری موضوعات اور جدید فنی تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر مرثیہ میں نیا رنگ وآہنگ پیدا کیا ہے۔

۱۹۴۱ء میں دوسری عالمی جنگ کے سبب جب تحریک آزادی اپنے مکمل عروج پر تھی تو جوشؔ نے حسین وانقلاب لکھ کر آہ وفغاں کے بجائے کردار امام حسین کی پیروی وتأسی کی ترغیب دی اور امام حسین واصحاب وانصار حسین کی شجاعت وبہادری، عزم وہمت اور صبر وشکر کے پرجوش بیان سے عوام میں بیداری کی لہر پیدا کی۔ امام حسین واصحاب حسین کے کارناموں کی پیش کش کے ذریعے جوش اپنے زمانے کے خلفشار، بدامنی، انگریزوں کی ریشہ دوانی، سرمایہ داری ومادہ پرستی کے خلاف عوام کو بیدار کرنا اور حکومت کے خلاف صف آرا ہونے کا جذبہ بیدار کرنا چاہتے تھے اسی لئے وہ بیان مصائب میں بھی اس مقصد کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

معاصرین جوشؔ میں نسیم امروہوی کا نام بہت اہم ہے انہوں نے دوسو کے قریب طویل ومختصر مراثی ہی نہیں کہے بلکہ پاکستان میں سینکڑوں جدید مرثیہ گویوں کی ذہنی تربیت بھی کی۔ انہوں نے پہلا مرثیہ 'تجھ میں اے باغ وطن اب گل خوش رنگ نہیں' چوبیس برس کی عمر میں کہا تھا جس کے چہرے میں انہوں نے اوج کی سماجی تنقید کی روش سے متاثر ہوکر قوم کے درد وغم کو پیش کیا مگر بعد کے حصے میں تازگیٔ خیال کے باوجود خاندانی رنگ بہت نمایاں ہے۔ ترقی پسند تحریک سے تیرہ برس قبل کہے مرثیے میں نسیم نے ترقی پسندانہ رجحانات پیش کرکے یہ ثابت کردیا کہ مرثیے میں ترقی پسند رجحانات دیگر

اصناف سے پہلے وجود میں آ گئے تھے اس مرثیے میں انہوں نے اس دور کے حالات اور گردو پیش کا جائزہ پیش کرتے ہوئے زمانے کے مسائل ومشکلات کو نہ صرف پیش کیا بلکہ ان کا حل بتا کر معاشرہ کی اصلاح وتربیت کا کام کیا اور مرثیہ کے علمی مزاج کو بلند کرتے ہوئے اسے اپنے دور کے مطالبات سے اس طرح ہم آہنگ کر دیا کہ وہ شاعری رہے تاریخ نہ معلوم ہو۔

۱۹۳۰ء میں انہوں نے 'فضائل علی ابن ابی طالب قران و حدیث سے ،موضوع پر مرثیہ کہا جس کا مطلع ہے' شمع افروز حیات ابدی ہے شاعر'۔ ۱۹۳۵ء میں فیض آباد کی سالانہ مجالس کے لئے سیاست علویہ کے موضوع پر انہوں نے ایک مرثیہ کہا جس کا مطلع تھا' سیاست علوی حکمت الٰہی تھی'۔ ۱۹۳۶ء میں نسیم نے' شہید معرکۂ جہد ارتقا ہے حسین' کہا نسیم نے اس مرثیہ میں بھی سماجی موضوعات کو اہمیت دی مگر یہاں وہ تجریدی عنوانات کے بجائے منقبت کے راستے سے موضوع تک آتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ نسیم کے یہاں وقت کے ساتھ ساتھ سماجی تنقید کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا ہے۔

معاصرین جوش میں دوسرا نام جمیل مظہری کا ہے وہ صنف نظم سے مرثیہ تک آئے ہیں اس لئے ان کے یہاں مرثیہ میں قومی مضامین نے راہ پائی ہے۔انہوں نے پہلا مرثیہ' عرفان عشق' ۱۹۳۰ء میں مولانا آزاد کی تقاریر سے متاثر ہو کر کہا جس کا مقصد سیاسی عنصر کو نمایاں کرنا نہیں بلکہ اس میں ایک ایسا فلسفیانہ انداز ہے جو ہمیں غالب کی یاد دلاتا ہے،ان کا دوسرا مرثیہ' پیمان وفا' ہے جو انہوں نے ۱۹۳۶ء میں کہا اس میں سیاسی بصیرت اور تاریخی شعور کا عنصر بہت واضح ہے۔۱۹۳۵ء میں جارج پنجم کی جوبلی کے موقع پر ماہ عزاء کی پرواہ کئے بغیر لکھنؤ کے امامباڑوں میں چراغاں کا حکم ہوا جس کی تعمیل بہت آسانی سے ہوگئی قوم کی اس بے حسی کو شعراء نے تنقید کا نشانہ بنایا۔جمیل نے بھی اپنے اس مرثیے میں قوم کی تساہلی اور بے حسی کی تاریخ نظم کی۔طنزیوں بھی سیاسی وسماجی تنقید کا مؤثر ترین حربہ ہے لیکن جمیل نے بیانیہ خاکے میں طنز کو ڈرامائی سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا ہے جس سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

جمیل نے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۱ء کے درمیان دو مرثیئے عزم محکم اور مضراب شہادت کہے ہیں جن میں سیاسی عنصر کے بجائے فلسفیانہ عنصر کا اضافہ محسوس ہوتا ہے اس لئے کہ آزادی اور تقسیم ہند کے بعد کی سیاست اپنے اندر بلند آہنگی نہیں رکھتی تھی جسے جمیل نے محسوس کیا اور قومی جذبے کو معتدل انداز میں تشبیب تک محدود رکھ کر اپنی فنکاری کا ثبوت فراہم کیا مثال کے طور پر مضراب شہادت کا یہ بند دیکھئے:

ظلمت کدے میں ہند کے محشر بپا ہے آج   تہذیب اپنے خون سے رنگیں قبا ہے آج
رفتار وقت مدعئ ارتقاء ہے آج   لیکن جو ہو رہا تھا وہی ہو رہا ہے آج
جنس خودی جہاں میں ہے ارزاں اسی طرح
انسان کا غلام ہے انساں اسی طرح

جدید مرثیہ نگاروں کے لئے سب سے مشکل منزل مرثیے کی حدود میں رہتے ہوئے اصلاحی،فکری،سماجی،سیاسی،انقلابی وفلسفیانہ موضوعات کو پیش کرنا تھا یہ مشکل جمیل کے لئے بھی تھی نتیجہ یہ کہ وہ جوش کی سی تشکیک اور ترقی پسندانہ رجحانات لے کر مرثیہ کے میدان میں داخل ہوئے تو واقعہ کربلا کے سیاسی،سماجی اثرات کے مقابلے مذہبی،روحانی اور فکری عوامل کی سطح پر زیادہ کامیاب ثابت ہوئے انہوں نے خیر وشر،حق و باطل،ظالم ومظلوم کے تصادم کے موقع پر بھی دونوں کو ایک سطح پر نہیں آنے دیا۔

جمیل مظہری کے یہاں یہ کشمکش وتصادم مرثیہ افسانہ ہستی میں اور زیادہ واضح شکل اختیار کر لیتا ہے۔جمیل مظہری نے انیس سو ساٹھ سے انیس سو اسی کے درمیان چار مرثیئے شام غریباں،لمحۂ غور،علمدار وفا اور حقیقت نورونار کہے مؤخر الذکر تینوں مرثیئے اصلاحی نقطۂ نظر سے کہے ہیں ان میں قوم کی

بے عملی،خام خیالی،تنگ نظری،جہالت کی پستی ورسوائی دیکھ کرشاعر کے سینے میں جوناسور بنا ہےاس کا فن کارانہ ظہار ہوا ہے ملاحظہ ہوں لمحۂ غور کے درج ذیل بند:

گزریں صدیاں تمہیں مظلوموں پہ کرتے ہوئے بین پھر بھی معلوم نہیں ہے تمھیں تاریخ حسینؑ
تم نے دنیا کو کبھی ظلم سے نفرت نہ دلائی رائیگاں ہو گیا ہر فلسفۂ شیون و شین
میرا کیا منھ جو کروں اہلِ ولا پر تنقید
صورت حال ہے خود رسمِ عزا پر تنقید

مجلسیں بھی نہ بنیں مدرسۂ بیداری وہی افسانہ گری اور وہی افسوں کاری
تعزیوں کا یہ تجمل یہ جلوسوں کا شکوہ اور یہ زنجیروں کی جھنکار میں ماتم داری
سوچو ! کیا تم نے دیا دیدۂ بینا کے لئے
ہاں تماشا تو بنے چشمِ تماشا کے لئے

اس ضمن میں جو چیز جمیلؔ کو اوروں سے منفرد کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اس طرح کے اصلاحی موضوعات کو بھی رثائیت کے دائرے سے باہر نہیں جانے دیتے حقیقت نورونار کے یہ بند دیکھئے

حیرتِ دیدۂ تہذیب ہے عاشور کی شام آنکھ سورج نے جھکا لی ہے کہ جلتے ہیں خیام
دل تفتیدۂ زینب سے بھی اٹھتی ہے اک آگ ہے یہی اس کے لپکتے ہوئے شعلوں کا پیام
جس کا دل زندہ ہے اس سوگ کو اس جاگ کو لے
اپنا گھر پھونک سکے جو وہی اس آگ کو لے

آہ تم لے نہ سکے یہ طپشِ غم اے دوست تم سے محروم رہا ماہِ محرم اے دوست
تم نے زنجیروں سے سینے تو کئے چاک اپنے شبِ عاشور کیا آگ کا ماتم اے دوست
بہرور ہو نہ سکے گرمیٔ احساس سے تم
اک شرر لے نہ سکے اسوۂ عباس سے تم

دیکھ لو دیکھ لو اس بے شرری کا انجام گونجتا اب نہیں سڑکوں پہ حسینی پیغام
سر کو نہوڑائے جھکائے ہوئے گردن اپنی ایک کونے میں کھڑا ہے علم پاک امام
شعلہ ایمان کا ٹھنڈا نظر آتا ہے مجھے
لکھنوٴ برف کا تودا نظر آتا ہے مجھے

آج وہ سوز شرر بار کہاں ہے تم میں تپشِ سینۂ احرار کہاں ہے تم میں
سر تسلیم تو خم ہے کہ مسلماں ہو تم ! شعلۂ جرأت انکار کہاں ہے تم میں

اثر منفعل غم ہیں یہ آنسو تو نہیں
اپنی تاثیر سے شبنم ہیں یہ آنسو تو نہیں

معاصرین جوشؔ میں ایک اور اہم نام سید آل رضاؔ کا ہے وہ غزل کی راہ سے مرثیے تک آئے ہیں انہوں نے ۱۹۳۹ء میں پہلا مرثیہ 'کلمۂ حق کی ہے تحریر دل فطرت میں' کہا، انہوں نے جب مرثیہ کی دنیا میں قدم رکھا تو ہندوستان پر آشوب سیاسی حالات سے گزر رہا تھا ایسے حالات میں وہ اپنے دائرۂ تخاطب کو وسیع کرنا چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے واقعہ کربلا کے رزمیہ پہلوؤں کے بجائے اس کے فکری پہلوؤں کی جانب توجہ کی اور اس کے مختلف پہلوؤں کو عوام کے سامنے یوں رکھا کہ وہ اس کی اہمیت سے واقف ہوں۔ یہ مرثیہ چوں کہ تحریک آزادی کے زمانۂ شباب میں کہا گیا تھا اس لئے اس کا انداز تشریحی اور قومی جذبات سے پر ہے۔

'اسلام دین فطرت انساں ہے دوستو' اسی روایت کی کڑی ہے اس میں آل رضاؔ کا تاریخی شعور نہایت واضح دکھائی دیتا ہے، اس کا مطلع ہی ان کے موضوع کو معین کر دیتا ہے ۔دور حاضر کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ انسان نے اپنے آپ کو خود ہی نظریاتی اور عملی دونوں حیثیتوں سے انسانی عظمت کی بلندیوں سے گرادیا ہے۔ سائنس نے کائنات اور زندگی کو اتفاقی حادثہ کہہ کر زندگی کی ساری معنویت اس سے چھین لی ہے جب کہ اسلام انسانی عظمت پر زور دیتا ہے اور اسے شعور وادراک کا حامل اور قوت ارادی کا مالک قرار دے کر نفس شناسی کے ذریعے عرفان الٰہی کی منزل تک پہنچاتا ہے اور زندگی کی جدوجہد کو ایک سمت عطا کرتا ہے اور اس کا مقصد معین کرتا ہے آل رضاؔ نے تمہید ہی میں انسان کی عظمت اس کے مقصد تخلیق اور ایک صالح نظام کائنات پر بھرپور روشنی ڈالی ہے اور فرد کی اہمیت کو نمایاں، شخصیت کو اجاگر اور اجتماعی زندگی کو مربوط کرنے کی کوشش کی ہے اس مرثیے میں آل رضاؔ نے سیاست سے ماورا ہو کر فلسفہ کی وادی میں قدم رکھا ہے اور دعوت عشیرہ سے وفات پیغمبر اکرم تک اور بعد وفات حقوق کی بازیابی اور تحفظ اسلام تک کے سارے اہم واقعات کو فن کارانہ حسن وخوبی کے ساتھ اشاروں اور کنایوں میں بیان کیا ہے جس سے ان کا مکمل نقطۂ نظر واضح ہو جاتا ہے آل رضاؔ کا یہ مرثیہ داخلی تنظیم کے اعتبار سے جمیلؔ مظہری کے افسانۂ ہستی سے بہتر ہے اس لئے کہ اس میں انہوں نے تمام فکری مسائل کو سوانح وتاریخ کے حصہ سے مربوط رکھا ہے۔

مرثیہ پر ایک عام اعتراض یہ تھا کہ کربلا کی خواتین کے کرداروں کو عزم واستقلال سے عاری بنا کر پیش کیا گیا ہے اس لئے جدید مرثیہ نگاروں نے اس پر توجہ دی آل رضاؔ نے شہادت کے بعد میں ضمنی طور پر اور شریکۃ الحسین میں مکمل طور پر جناب زینب کے کردار کے ذریعے ان کے عزم واستقلال کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

آل رضاؔ کے بعد مرزا تجمل حسین تجمؔ آفندی جدید مرثیہ کا ایک اور نمایاں نام ہے جدید مرثیہ کے تعمیری عہد میں ان کا فن شاعری اپنی معراج کمال پر تھا وہ قصیدے، سلام اور نوحے کے بعد جب پچاس سال کی عمر میں مرثیہ کہنے کے لئے آمادہ ہوئے تو ان کے پاس کہنہ مشقی کے ساتھ ساتھ جذبۂ اصلاح اور دعوت غور وفکر کا عملی تجربہ تھا۔ تجمؔ نے صرف دو مرثئے کہے لیکن یہ دونوں مرثئے اپنے حسن فکر، ندرت مواد، طرز تخاطب اور اسلوب نگارش کے اعتبار سے جدت فکر وفن کا نادر نمونہ ہیں ان کے پہلے مرثئے فتح مبین کے یہ بند دیکھئے :

جب لے لیا حسین نے میدان کربلا　　بدلا لہو سے رنگ گلستان کربلا
تھا وقت عصر اور ہی عنوان کربلا　　سوتا تھا فرش خاک پہ مہمان کربلا

بے سر تھا فرش خاک پہ لاشہ پڑا ہوا
بالیں پہ فتح حق کا تھا جھنڈا گڑا ہوا

نظم جہاں بدلنے کا عنوان مرحبا
اسلام کی نجات کا سامان مرحبا
انساں صداقتوں کا نگہبان مرحبا
بندہ خدا کی راہ میں بے جان مرحبا
اپنا اصول چھوڑ گیا غور کے لئے
اس کا پیام ایک ہے ہر دور کے لئے

عہد جدید کا مرثیہ نگار چوں کہ اعلیٰ تصورات کی پیش کش وترویج کے لئے کوشاں ہے اس لئے سیادت نسلی کے ساتھ ساتھ اس کی نظر عمل پر ہے تا کہ اس کے ذریعے اسلام کے نظریۂ مساوات کو ذریعۂ تبلیغ بنا سکے۔ نجم نے اپنا دوسرا مرثیہ معراج فکر ستر برس کی عمر میں ۱۹۶۰ کے قریب کہا جب روسی راکٹ تیزی سے چاند کی طرف بڑھ رہا تھا اور دنیا ایک نئے دور میں داخل ہونے کو بے قرار ومضطرب تھی۔ نجم کے اس مرثیہ میں سیاسی وعصری رنگ بہت زیادہ ہونے کے سبب کہیں کہیں خطابت کا انداز پیدا ہوا ہے مگر انہوں نے مرثیہ کے اصلاحی وتبلیغی پہلو کو نظرانداز نہیں ہونے دیا درج ذیل بند دیکھئے جن میں نجم نے اتحادواتفاق کی فضا کا بیان کیا ہے:

ہر قوم میں ہے جس کی شہادت کا احترام
دنیا میں جس کا نام ہے اک مستقل پیام
اس درجہ اس کا ذکر ہے مقبول خاص و عام
ہر اک زباں کے شعر و ادب میں ملا مقام
تقریر و نظم و نثر کی کچھ انتہا نہیں
اب تک کسی کا تذکرہ اتنا ہوا نہیں

بے امتیاز مذہب و ملت ہے جس کا سوگ
اکثر مٹا دیا ہے تعصب کا جس نے روگ
کتنے ہیں اب قریب بہت دور تھے جو لوگ
نامسلموں نے عشق میں جس کے لیا ہے جوگ
بھارت نواسیوں کو خطاب اک نیا دیا
کتنے برہمنوں کو حسینی بنا دیا

نجم آفندی کے بعد جدید مرثیہ نگاروں کی فہرست میں جو اہم نام سامنے آتا ہے وہ جعفرمہدی رزمؔ کا ہے رزم نے ایک خواب کے زیراثر دوران طالب علمی شاعری شروع کی جس زمانے میں انہوں نے شاعری کی ابتدا کی اس زمانے میں نجم آفندی ان کے وطن ردولی ہی میں مقیم تھے تین سال تک ان کے فیض صحبت میں رہے جس کے سبب ان کے کلام میں صناعی اور فنی پختگی پیدا ہوئی۔ قصیدہ، نوحہ وسلام میں مشاقی کے بعد روایتی طرز کے کچھ مرثئے کہے مگر نجم کی تربیت اور زمانے کے بدلتے رجحانات کے سبب مرثیہ کا نیا رنگ اختیار کیا۔ یہ نیا رنگ ان کے یہاں اس لئے بھی تیزی سے در آیا کہ وہ صرف شاعر ہی نہ تھے سیاسی اور قومی معاملات میں بھی دخیل تھے جس کا اثر ان کی فکر پر پڑنا لازمی تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں تحریک آزادی اپنے شباب پر تھی پرانی قدریں تبدیل ہو رہی تھیں نتیجے میں رزمؔ کے مراثی کا انداز تبدیل ہوا اور انہوں نے مختلف موضوعات کو منتخب کر کے مرثئے کہنا شروع کئے اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اسلامیات سے متعلق تقریبا ہر اہم موضوع پر ایک اچھی نظم

وجود میں آگئی ان کے منتخب کردہ موضوعات میں غلامی اور اسلام،عورت کا درجہ اسلام میں،فلسفۂ حیات اور حسین،حقوق انسانی اور اسلام وغیرہ اہم ہیں۔ رزمؔ نے مذکورہ موضوعات پر مرثئے کہہ کر اردو نظم کے دامن کو فکر و فلسفہ کی دولت سے مالا مال کیا مثال کے طور پر ان کے مرثیہ تشہیر و تبلیغ کے یہ دو بند دیکھئے:

کھولا ہے جس نے عقدۂ موئے حیات کو — جس نے سنوارا گیسوئے حسن صفات کو
جس نے کیا بلند نظر کائنات کو — دنیا میں جس نے نشر کیا حق کی بات کو
تفریق خیر و شر کے لئے حوصلہ دیا
کم ہمتوں کو جس نے مجاہد بنا دیا

عظمت سے خوں کی مضطرب الحال تھا جو دہر — کیا اہل دیہہ، کانپتے تھے ساکنان شہر
شیرینئ حیات تھا کام و دہن میں زہر — آثار کہہ رہے تھے کہ اب آیا خدا کا قہر
طوفان ظلم و جور جو حد سے گذر گئے
خوشیاں منانے والوں کے چہرے اتر گئے

رزمؔ نے فلسفۂ حیات اور حسین کے ابتدائی حصہ میں وفات رسول کے بعد زندگی کی ابتری کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے جو ان کے عہد کے پر آشوب حالات کا منظر نامہ بھی محسوس ہوتا ہے مثال کے طور پر اس مرثیے کے درج ذیل بند دیکھئے:

زندگی کیا تھی فقط کہنے کو نام زندگی — درہم و برہم تھا سر تا سر نظام زندگی
بے حسی کی بستیاں تھیں اور مقام زندگی — حاملانِ زندگانی تھے غلام زندگی
سانس لے لیتے تھے آہ سرد بھرنے کی طرح
زیست پر قابو نہ تھا جیتے تھے مرنے کی طرح

حکمِ استبداد کی شدت سے گھبرائے ہوئے — اک نئی فرعونیت سے ذلتیں پائے ہوئے
تھے غلامی کی بلا سے لب پہ دم آئے ہوئے — جینے والے مرنے والوں سے تھے شرمائے ہوئے
زندگی بھاری تھی دل اس بوجھ سے ہیجان تھا
زندہ لاشوں کا زمانہ ایک گورستان تھا

سر پہ پھر منڈلا رہی تھی ظلمتِ عہد کہن — چھا رہی تھی قلب ہستی پر بلائے ریب وظن
ذہنیت کو روندتا تھا بے حسی کا اہرمن — چھن رہا تھا زیست سے انسانیت کا بانکپن
دست اندازی تھی ایسی خوف کی وسواس کی
دھجیاں اڑنے لگی تھیں دامنِ احساس کی

مٹ رہا تھا روحِ آزادی کا حق پرور جمال — مائلِ پستی تھا یکسر آدمیّت کا کمال
نزع کے عالم میں تھے انساں کے پاکیزہ خصال — عزتِ نوعِ بشر کے سر پہ تھی تیغِ زوال

گھٹ رہا تھا دم مگر جرأت نہ تھی اظہار کی
تھی رگِ انسانیت اور دھار تھی تلوار کی

ان حالات کی تبدیلی کے لئے امام حسین نے جو کارنامہ انجام دیا اس سے اپنے عہد کے لوگوں کو صرف باخبر ہی نہیں کراتے بلکہ وہ اس سے استفادہ کرتے ہوئے موجودہ سماج کو بدلنے کے لئے تأسیٔ حسین کی بات کرتے ہیں:

یہ مثالی زندگی اور اپنا عالم دیکھئے   یہ مرقع دیدۂ عبرت سے پیہم دیکھئے
دل نہیں قابو میں تو با چشم پر نم دیکھئے   درس لینے کے لئے یہ آیتِ غم دیکھئے
جذبۂ الفت کو اپنے جذب کامل کیجئے
اس حسینی زندگی سے کچھ تو حاصل کیجئے

ہاں حسینیت کا کاندھے پر علم لے کر بڑھو   عزم کی شوکت ارادے کا حشم لے کر بڑھو
سعیٔ پیہم اور ہمت کے قدم لے کر بڑھو   اپنے دل میں تم عزاء کی روحِ غم لے کر بڑھو
ہاں بڑھو دنیا پلٹ دی کوشش و اقدام نے
راستہ سیدھا ہے منزل ہے نظر کے سامنے

ہاں بڑھو اور ڈوب جاؤ عالمِ پر نور میں   کھینچ لو کیف تصرف دیدۂ مخمور میں
دل ہی دل ہوجاؤ شوق ِ جلوۂ مستور میں   بجلیاں ہیں آج بھی لرزاں حسینی طور میں
جوشِ خالص چاہیئے جذبِ تولّا چاہیئے
پھر تجلّی پوچھتی آئے گی خود کیا چاہیئے

کیوں تأسی میں قدم اٹھتے نہیں ہیں بیشتر   کیوں جھجکتے ہو نہیں کیا نقش گہرا قلب پر
تم خبر رکھتے ہوئے بھی بے خبر سے ہو مگر   ہو حسینی کارنامہ مستقل پیشِ نظر
ہر نفس روشن نہ ہوجائے یہ وہ غم ہی نہیں
یادِ مولا کے لئے قیدِ محرّم ہی نہیں

یہی رزؔم کی فکر کا وہ اساسی پہلو ہے جس کا اظہار ان کے دیگر مرثیوں میں بھی ہوا ہے۔

اولاد حسین شاعؔر لکھنوی فطرتاً شاعر، ادیب وصحافی تھے انہوں نے عملی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، ایک مجاہد، شاعر، مقرر وصحافی کی حیثیت سے اپنی پہچان بنائی 'سبد گل' ان کی قومی و وطنی شاعری کا مختصر مجموعہ ہے جس سے ان کے دل میں پوشیدہ انگریز دشمنی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے مگر ان کے والد آقا حسن نے شاعر کی اس روش کو دیکھتے ہوئے ایک منصوبہ کے تحت ان کو رام پور بھیج کر مولوی و واعظ بنا دیا۔ رام پور کی فضا شاعر کے لئے قید خانہ بن گئی۔ ملازمت رام پور کے دوران شاعر فطرت کے شدید تقاضوں کو نظر انداز نہ کر سکے اور مختلف اصناف شاعری میں طبع آزمائی کرتے رہے مہدی نظمی نے ان کے مرثیوں کی تعداد کے بارے میں لکھا ہے کہ '۔۔ نہ جانے کتنے مرثیے کہے ہوں گے جو دوسروں کے ہتھے لگ گئے ۔۔ لیکن ان کے چار مرثئے

شمس الحسن تاج کے پاس موجود ہیں، راقم کے پیش نظران کا مطبوعہ مرثیہ اسلام اور مزدور ہے اس میں شاعر نے اپنے عہد کی صورت حال پیش کی ہے اور ائمہ کرام کی زندگی سے محنت ومشقت کی مثالیں پیش کی ہیں جس کا مقصد سامعین سے داد وتحسین حاصل کرنا نہیں بلکہ اپنے عہد کے لوگوں کو محنت ومشقت ومزدوری کے لئے آمادہ کرنا ہے اس لئے کہ ان کے زمانے میں شرفائے لکھنؤ محنت ومشقت کے بہت سے کام اپنے لئے باعث ننگ وعار سمجھتے تھے۔

شاعر نے انبیاء وائمہ کرام کی حیات طیبہ سے نجاری، باغبانی، آلات گری، صنعت وحرفت کے واقعات تلاش کر کے اس انداز میں پیش کئے ہیں جس سے سماج میں موجود احساس کمتری کے جذبات واحساسات کا خاتمہ ہو جائے اور انسان اس حقیقت کا عرفان حاصل کر لے کہ بیکار رہنے سے مزدوری بہرحال بہتر ہے اسلئے کہ اس سے رزق حلال بھی ملتا ہے اور انبیاء وائمہ کی تاٗسی وپیروی بھی ہوتی ہے:

کاٹنے جاتے ہیں خندق میں زمینوں کے طبق رنگ رخسار کہ کھلتے ہوئے لالے کا ورق
بے کتاب اہل عمل کے لئے محنت کا سبق تخم تھا عزت مزدور کے ماتھے کا عرق
تھا یہ مقصد عرق میں سر وسینہ ڈوبے
پر نہ مزدور کا دنیا میں سفینہ ڈوبے

بھاپ اور برق کی دنیا کو بسایا کس نے زور سے سینے کے کشتی کو چلایا کس نے
راستہ اہل تجارت کو بتایا کس نے ڈھیر سرمائے کا ڈیوڑھی پہ لگایا کس نے
کس کا لایا ہو ا یہ مال ہے بازاروں کا
نام ہے اہل دول کس کے نمک خواروں کا

برسوں آدم نے زمینوں پہ زراعت کی ہے نوح نے ناؤ بنانے میں مشقت کی ہے
سوزن ادریس کو جنت نے عنایت کی ہے یعنی اللہ نے مزدور کی عزت کی ہے
تا علی شہ تھی جو مزدور کو درکار ملی
اک کو سوزن ملی اورایک کو تلوار ملی

آج گو پیشۂ مزدور زمانے میں ہے عیب کار مرسؐل تھا یہی اس میں نہ شک کوئی نہ ریب
طور پر جس کی نظر نے کیا نظارۂ غیب تھے وہی حضرت موسیٰ کبھی مزدور شعیب
کام امت کا کیا شرکت ہارونی سے
بیر خالق کو تھا سرمایۂ قارونی سے

تھا نہ حدادوں میں داؤد پیمبر کا نظیر مالک تخت سلیماں تھے بناتے تھے حصیر
پیٹھ پر بو جھ اٹھاتا تھا علیؑ کل کا امیر فاطمہؑ صاف کیا کرتی تھیں اجرت پہ حریر
پنجتن کی تھی غذا فاقوں کی مجبوری میں
جو یہودی سے جو مل جاتے تھے مزدوری میں

اس کے بعد شاعر نے اس حقیقت کو بھی ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ دنیا میں امارت وغربت کی بناء پر کسی قسم کی تفریق درست نہیں اسلئے کہ خالق کی نظر میں سب بندے برابر ہیں:

اسکے سب بندے برابر ہیں امیر اور غریب　　نہ کوئی دور ہے اس سے نہ کوئی اسکے قریب
سب کی سنتا ہے دعا نام ہے خالق کا مجیب　　اسکے بندوں کو جو چاہے وہی اس کا حبیب
طالب رحم جو احمدؐ ہوئے مطلوب بنے
ان کو سب پیارے ہیں اس واسطے محبوب بنے

جدید طرز کا مرثیہ کہنے والوں میں زائرؔ سیتاپوری کا نام بھی شامل ہے انہوں نے کل ۱۸ مرثیے کہے مگر زیادہ تر غیر مطبوعہ اور نایاب ہیں انہوں نے پہلا مرثیہ ۱۹۳۲ء میں کہا تھا۔ ان کا صرف ایک مرثیہ ایسا ہے جو کئی بار شایع ہوا' دنیا کو ایک راہ نما کی تلاش ہے' اس میں انہوں نے غریبوں، ناداروں اور مسکینوں کا ذکر کرتے ہوئے دنیا کو یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ امام حسینؑ مظلوموں، بیکسوں اور ناداروں کے حقیقی رہ نما ہیں ذیل میں اس کے چند بند دیکھئے جس میں زائرؔ نے دنیا میں پھیلے ہوئے ظلم وستم کی صورت حال واضح کرنے کی کوشش کی ہے:

عالم کے خشک و تر میں عجب انقلاب ہے　　سفاکیوں کا ظلم و ستم کا شباب ہے
ہر زندگی جہان میں پر اضطراب ہے　　امن و سکون کا لب بام آفتاب ہے
چھائی ہوئی ہے ظلمت غم کائنات پر
پردے پڑے ہوئے ہیں جمال حیات پر

دولت سے ہے تمیز شریف و رذیل کی　　پھر اس میں بھی حدیں ہیں کثیر و قلیل کی
انسانیت کی قدر نہ نفس جلیل کی　　بس مرکز خیال ہے جھولی بخیل کی
جنت ہے اک نگاہ تمنا کے سامنے
سجدے میں دل ہیں دولت دنیا کے سامنے

سرمایہ داروں کے فلک بوس یہ محل　　عشرت کدوں کی شام و سحر یہ چہل پہل
کیا ہے فقط ہے یہ نفس پرستی کا اک عمل　　انسانیت کے واسطے کاشانۂ اجل
کھویا ہے دل فریب تمدن کی راہ میں
دم توڑتی ہے عزت انساں گناہ میں

اف درد سے بھری وہ کسانوں کی زندگی　　روتی ہے جن کے حال پہ خود ان کی بیکسی
وہ کشمکش حیات کی وہ ان کی خامشی　　افلاس کی وہ ان پہ نگاہیں جمی ہوئی
چپ ہیں اگر چہ دل میں غم کائنات ہے
اک ساز بے صدا ہے کہ ان کی حیات ہے

ہاں پستیوں سے اوج کا ہے ایک راستہ   دولت کے ہاتھ کیجئے سودا ضمیر کا
پھر دیکھئے تمام زمانے کا ریجھنا   کیا دور ہے جو آپ کو کہنے لگیں خدا
مافوق اپنے ظرف سے رتبہ بشر کا ہے
ادنیٰ سا ایک طلسم یہ ارباب زر کا ہے
نظم و نسق میں رہبر اعظم بنا کوئی   آزادیوں کی روح مجسم بنا کوئی
دنیا کو ترک کر کے مکرم بنا کوئی   اسرار کائنات کا محرم بنا کوئی
اب بھی مگر سکون کا دل پاش پاش ہے
دنیا کو ایک راہ نما کی تلاش ہے
اس رہ نما میں قوت ایثار چاہیئے   سرمایہ سوز ہمت نادار چاہیئے
پر امن روح فطرت افکار چاہیئے   ہو صبر جس کا نام وہ تلوار چاہیئے
دکھ درد سے بھرے ہوئے ہر دل کا چین ہے
وہ رہ نما حسینؑ ہے تنہا حسینؑ ہے

ان میں دولت وطاقت کی ستیزہ کاریوں کے مرقعوں کو دیکھ کر بآسانی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ترقی پسند نظریات سے بے انتہا متأثر تھے۔

آزادی کے بعد جدید مرثیہ کی دنیا میں اپنی پہچان بنانے والے مرثیہ گویوں میں احسنؔ رضوی کا نام بھی شامل ہے مطلع حیات میں شامل چودہ مرثیئے احسنؔ کی زندگی کے آخری دور کی یادگار ہیں جب وہ فکروفن کے اعتبار سے پختہ کار ہو چکے تھے۔ان کے مراثی بادی النظر میں روایتی معلوم ہوتے ہیں مگر یہ روایتی نہیں کہے جاسکتے اس لئے کہ ان کا موضوع اوراسلوب جدید نہج کا ہے۔انہوں نے اپنے اکثر مرثیوں میں بے ثباتیِ دنیا،فنا اورموت کے تذکروں کے ذریعہ انسان کے اندرخوابیدہ انسانیت کو بیدار کرنے اوراسے خوابِ غفلت سے چونکانے کا کام لیا ہے۔

احسنؔ کے نزدیک زندگی مقصدوعمل سے عبارت ہے اورمقصدوعمل سے عاری زندگی موت ہے مثال کے طور پر:

زندگی ہی سے ہے سب نقش و نگار گیتی   رونق صورت گل رنگ بہار گیتی
نغمہ پیرا اسی زخمہ سے ہے تار گیتی   روح عالم ہے کہ یہ وجہ قرار گیتی
زندگی نہ رہے کوئی بھی عالم نہ رہے
خندۂ گل نہ رہے گریۂ شبنم نہ رہے
زندگی سانس لئے جانے کا ہرگز نہیں نام   زندگی جذبۂ ایثار کا پہلا انعام
زندگی نغمۂ تسلیم حقیقت کا پیام   زندگی صفحۂ تخلیق پہ ہے نقش دوام
زندگی ان کی ہے مرنا جو گوارا کر لیں
تیغ کی زد پہ ٹھہرنا جو گوار ا کر لیں

آبرو زیست کی پامال اگر ہوتی ہے
ایسے حالات میں پھر خاص نظر ہوتی ہے
حد سے افزوں خلش سوز جگر ہوتی ہے
شکل دنیائے دنی نوع دگر ہوتی ہے
ہاتھ بڑھ جاتے ہیں تبدیل نظامت کے لئے
قدم اٹھتے ہیں شکست سر نخوت کے لئے

(مطلع: زندگی راز بھی ہے پردہ دراز بھی ہے)

نہیں ہے یاد تمہیں خطبہ ٔ جناب امیر
ہے بے ثباتیٔ دنیا پہ اک عجب تقریر
یہ ما ل و دولت و حشمت، حکومت و جاگیر
ہمارے حق میں ہے بکری کی چھینک سے بھی حقیر
چلو ہٹاؤ یہ جھگڑا چکائے لیتے ہیں
کنار نہر سے خیمے ہٹائے لیتے ہیں

(مطلع: کنار نہر شہ دیں کا کارواں اترا)

مہماں سرا ہے خانۂ دنیا کہیں جسے
ہے یا نہیں مکان کا دھوکا کہیں جسے
منظر یہ ہے طلسم تماشا کہیں جسے
کم ہو رہا ہے زیست کا وقفہ کہیں جسے
ٹھہرے ہوئے قدم کو بڑھانا ضرور ہے
آیا ہے جو یہاں اسے جانا ضرور ہے

(مطلع: خاموش ہے چراغ تمنائے کائنات)

احسنؔ کے مرثیوں میں سراپا کے بجائے سیرت وکردار کے پہلوؤں کونمایاں کرنے کی جو روش ملتی ہے اس کے ذریعے وہ بگڑی ہوئی اخلاقی، معاشرتی اور سماجی صورت حال کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں مثال کے طور پر ذیل کا بند ملاحظہ کیجئے جس میں حضرت علی کی سیرت کا ایک روشن پہلو اس طرح بیان کیا ہے جس سے انسانی قدروں کی بحالی میں کافی مدد ملتی ہے

قاتل کو بھی نہ جو نظر انداز کر سکا
اس کے کرم کا شکر ہو کیوں کر بھلا ادا
انسانیت کا اس کو کہاں تک لحاظ تھا
سر نامہ اپنے خوں سے معافی کا لکھ دیا
دشمن کے واسطے رہ بخشش بھی صاف تھی
یہ اس کا تھا نصیب کہ قسمت خلاف تھی

احسنؔ نے سماجی صورت حال کی زبوں حالی اور ابتری کو دور کرنے کے لئے کبھی کبھی جانوروں کو بھی اپنا محور ومرکز قرار دے کر اپنی بات کہنے کی کوشش کی ہے ملاحظہ ہوں درج ذیل بند:

بجا ہے فخر یہاں چیونٹیوں کو سلطاں پر
اصول زیست سکھاتی ہیں حکم یزداں پر
کرو نہ شک کہ ہیں کیوں کر کف سلیماں پر
نظر کی طرح چلی آتی ہیں یہ قرآں پر

انہی سے سیکھ کے ہر نقطہ دل پذیر کہو
حقیر کو بھی نہ ہر گز حقیر کہو

کئی لحاظ سے یہ آدمی سے بہتر ہیں — نہ خود غرض ، نہ منافق ، نہ طالب زر ہیں
یہ محنتی ہیں ، جفا کش ہیں ، قوم پرور ہیں — یہ مل کے رہتی ہیں امن و اماں کی خوگر ہیں
فساد ان میں نہ رجحان ہی بگاڑ کا ہے
ذرا سی جان ہے اور حوصلہ پہاڑ کا ہے

مرتضٰی اظہر رضوی ملت کالج دربھنگہ میں فلسفہ کے استاد تھے انہوں نے کل سات مرثیے کہے ہیں جو نوائے سکوت کے عنوان سے شایع ہو چکے ہیں ان مرثیوں میں انیسؔ، اقبالؔ، جوشؔ اور جمیلؔ کے انداز و آہنگ کی جھلک کے باوجود ایک اجتہادی شان نظر آتی ہے۔ وہ اندھی تقلید کے ہم نوا نہ تھے وہ روح عصر سے مکمل آشنا تھے اور انہیں انسانی زندگی کے نئے افق کا علم وادراک تھا اسی لئے وہ واقعۂ کربلا کے درس آموز پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں تا کہ اس کے ذریعے زندگی کو سنوارا جا سکے اور انسانی شرف و کمال کی معراج تک انسان کی رسائی کی راہیں کشادہ ہو سکیں ملاحظہ ہوں ذیل کے بند:

جب آدمی کو قوت تسخیر دی گئی — ذرّے کو مہر و ماہ کی تنویر دی گئی
آنکھوں کو خواب، خواب کو تعبیر دی گئی — لب کو دعا، دعاؤں کو تا ثیر دی گئی
دل کو ملا سکون بھی اور انتشار بھی
کچھ جبر بھی عطا ہوا، کچھ اختیار بھی

پوشیدہ تھے مزاج عناصر میں ظلم و جور — سطح جسد پہ ان کا تقاضہ ہی تھا کچھ اور
پیدا ہوئی جدال کی خو، سر کشی کا طور — اس واسطے شروع ہوا ابتلا کا دور
اس ابتلا میں دولتِ سمع و بصر ملی
یعنی اسے ہدایتِ قلب و نظر ملی

راہِ یقیں کے اس کو مسلسل ملے گواہ — تا گمرہوں کی دیکھ سکے حالتِ تباہ
اس واسطے خدا نے عطا کی اسے نگاہ — وجدان کی دکھائی گئی تیرگی میں راہ
اب یا تو شکر حق کرے یا کفر حق کرے
اس زندگی کا ناز کرے یا قلق کرے

جو لوگ کامیاب ہوئے امتحان میں — لا ریب اہل شکر ہوئے اس جہان میں
آزاد ہیں قیود زمان و مکان میں — سورہ کلام پاک میں ہے انکی شان میں
خاکی جسد میں رکھتے ہیں وہ نور کا مزاج
ملتا ہے ان کے جام سے کافور کا مزاج

دکن کے جدید مرثیہ گویوں میں باقر امانت خانی کا نام نمایاں ہے انہوں نے اپنا پہلا مرثیہ تصویر اجر رسالت کے عنوان سے کہا تھا۔نصف صدی سے زائد عرصہ میں سلام،نوحے،قصیدے،مسدس،قطعات ور باعیات کے علاوہ تین درجن سے زائد مرثیئے کہہ چکے ہیں جن میں سے ایک درجن سے زائد مطبوعہ ہیں جن کے عناوین شباب فکر،مرقع وفا،گہوارۂ شہادت،عروس فکر،جہادصبر،اشک پشیماں،آدم آل محمدؐ،فردوس مؤدت،کربلا،سفیر شجاعت،وغیرہ ہیں۔وہ مرثیہ گوئی میں اصلاحی نقطۂ نظر کے حامل ہیں اسی بناء پر وہ جھوٹ،مکر وفریب،سیاست میں قول وفعل کے تضاد،بدتہذیبی و جہالت اورقوم کی بےعملی کوزبردست تنقید کانشانہ بناتے ہیں

تہذیب کے اصول سے نفرت ہے آج کل　　غصّے کا جوش معنیٔ ہمت ہے آج کل
چھائی ہوئی دلوں پہ جہالت ہے آج کل　　معنیٔ سب و شتم شجاعت ہے آج کل
کہتے ہیں جس کو طیش صفت بزدلی کی ہے
چوبیس سال صبر، شجاعت علیؑ کی ہے

بے عزتی کے بھیس میں عزت ہے آج کل　　تار نظر کے ساتھ ہی الفت ہے آج کل
بے غیرتی کے رنگ میں غیرت ہے آج کل　　دل کی ہوس کا نام محبت ہے آج کل
بد بخت عاشقوں کا تو مقسوم ہی نہیں
معنیٔ عشق کیا ہیں یہ معلوم ہی نہیں

بے کار لوگ رکھتے ہیں بے کار مشغلے　　ان مشغلوں سے ان کے کبھی دل نہیں بھرے
دنیا میں عیب جوئی کی عادت ہو گر جسے　　منھ ڈال کر وہ اپنے گریباں میں دیکھ لے
یہ نقص کے صنم ہیں جو اپنے گھروں میں ہیں
خود میں بھی عیب ہیں وہی جو دوسروں میں ہیں

باقر امانت خانی فرقہ بندی وفرقہ پرستی کے سخت مخالف ہیں وہ تمام عالم انسانیت بالخصوص امت مسلمہ میں اتحادواتفاق دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے انہیں عزائے حسینؑ یاذکرحسینؑ ہی سب سے مؤثر اور کارگرذریعہ معلوم ہوتا ہے۔

سید قنبرحسین پیامؔ اعظمی کا نام عزائی حلقوں کے لئے نیانہیں ہے نصف صدی سے زائد عرصہ سے رثائی ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ مرثیہ گوئی کی جانب علامہ سید ذیشان حیدر جوادی مرحوم کے اثر سے مائل ہوئے اور ۱۹۶۵ء میں پہلا مرثیہ حسین اور اسلام کے عنوان سے کہا۔اب سے کچھ عرصہ قبل تک ۱۸ مرثیے کہہ چکے تھے ان کے مراثی کے دو مجموعے والفجراور والعصر کے عنوان سے شایع ہو چکے ہیں ان دونوں مجموعوں میں ان کے ۱۳ مرثیے شامل ہیں جن کے عناوین بالترتیب (حسین اور اسلام،داستان وفا،عورت،آنسو،اندھیرااجالا،آخری انقلاب،علی اور عباس،علم اور عباس) (قلم،سلسلۂ عصمت،اصحاب اہل بیت،ہجرت اور بدعت) ہیں۔

پیامؔ شاعری کو اصلاح مذہب وملت وسماج کا ایک ذریعہ تصور کرتے ہیں اور اگر یہ مقصد پورا نہ ہوتو ان کے نزدیک شاعری ساحری ہے اسی لئے وہ مسدس ہو یا سلام،مرثیہ ہو یا نوحہ،قصیدہ ہو یا قطعہ ہرجگہ دین ومذہب کے ذریعہ انسان کے کردار وسیرت کی اصلاح اور اسلامی اصولوں کی پیروی

اوران پرعمل کرنے کی تبلیغ کرتے نظرآتے ہیں تاکہ ایک اسلامی سماج ومعاشرہ کی تشکیل ہوسکے یہ حقیقت ہے کہ حد سے زیادہ مقصدیت پرتوجہ کے سبب اکثرفن مجروح ہوتا ہےاورایسی ہی صورت حال سے پیام کی مرثیہ گوئی بھی دوچار ہوئی ہےان کے مرثیے خوداس امر کے گواہ ہیں کہ فنی سطح پران کا حال ماضی سےخوش گوارنہیں ایسا لگتا ہے کہ وہ قوم کودیندار بنانے اورسماج ومعاشرہ کی اصلاح کی دھن میں فن کی طرف سے بےفکر ہوگئے ہیں۔

پیاؔم کے مرثیوں میں عورت اس اعتبار سےاہم ہے کہ شایداب تک کسی نےعورت کوموضوع بنا کرمرثیہ نہیں کہا۔عورت کو پیام کے فکروشعور کا بہترین نمونہ قرار دیا جاسکتا ہےاس لئے کہ اس مرثیے میں انہوں نے عورت کی ذات میں پوشیدہ ہر پہلو پرتبصرہ کیا ہے فکری اعتبار سے اسے سات حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔پہلا حصہ تمہیدی ہے جس میں انہوں نے عورت کا عمومی انداز میں تعارف کرایا ہے دوسرے حصہ میں عورت کی ذات میں نہاں مثبت ومنفی پہلوؤں کی نشاندہی قرآن وتاریخ کے حوالے سے اس طرح کی ہے کہ دونوں رخ عیاں ہوجاتے ہیں تیسرے حصہ میں مردکوتفوق وبرتری والے سماج ومعاشرے میں عورت پرہونے والے مظالم کی داستان بیان کرتے ہوئے اس بات کی کوشش کی ہے کہ خواتین کے حقوق سے متعلق اسلام پر جواعتراضات کئے گئے ہیں ان کا دفاع کیا جائے اس سلسلے میں مغرب کی نئی تہذیب کے دلدادہ عوام نے خواتین کی آزادی کا جوتصورپیش کیا ہےاس کی حقیقت دنیاپرروشن کرکےخواتین پرظلم کرنے والوں کے چہرے بےنقاب کئے جائیں اس حصہ میں ان کا طنزیہ لہجہ اثر کی کیفیت کودوبالا کردیتا ہے

کتنی مظلوم زمانے میں ہے یہ کشتۂ غم رہی ہر دور جہالت میں جو محروم کرم
کبھی زندہ اسے دفناتے تھے ارباب ستم کبھی محفل میں جلائی گئی یہ شمع حرم
اگلے لوگوں نے اسے پیکر جاں سمجھا
نئی تہذیب نے تفریح کا ساماں سمجھا

کرتے ہیں اہل قلم بھی اسے کیا کیا بدنام مئے کی بوتل کبھی کہتے ہیں کبھی زہر کا جام
کبھی پتھر کا بنا دیتے ہیں کہہ کر اصنام کبھی گلیوں میں رہے اس کو بٹھا کر لب بام
کھینچ کر صفحۂ قرطاس پہ نقشہ اس کا
فن کی دنیا میں دکھاتے ہیں تماشہ اس کا

نعرہ آزادئ نسواں کا لگانے والو جان تخلیق کو تفریح کا سامان بنانے والو
رقص گاہوں میں شرافت کو لٹانے والو ہوش میں آؤ ہمیں ہوش میں لانے والو
یہ نمائش نہیں جنس سر بازار نہیں
آبرو قوم کی ہے فلم کا کردار نہیں

آدمیت کا اک انعام ہے پردہ اس کا جلوہ افزائے در و بام ہے پردہ اس کا
طرۂ عظمت اقوام ہے پردہ اس کا آبروئے سحر و شام ہے پردہ اس کا
ہوئی بے پردہ تو کیا خاک سکوں پائے گی
شمع فانوس سے نکلے گی تو بجھ جائے گی

مرثیئے کے چوتھے حصے میں عصری تقاضوں کے تحت پیاؔم نے بیٹی کی اہمیت کوواضح کیا ہےاور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ بیٹے کے مقابلے میں بیٹی زیادہ خدمت گذار،وفاداراورغم گسار ہوتی ہے پانچویں حصے میں پیاؔم نےعورت کی زندگی کے ازدواجی پہلوکوپیش کرتے ہوئے اس کی اہمیت و ضرورت کوواضح کرنے کی کوشش کی ہےاوراس کے ایثاروقربانی کی مثالیں تاریخ سے پیش کرتے ہوئے بالواسطہ درس اخلاق دینے کی قابل تعریف سعی کی ہے۔مرثیہ کا چھٹا حصہ اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ اس میں عورت کے سب سے اہم پہلو ماں کے کردار کی طرف نگاہ کی ہے،یہیں آ کے عورت کی شخصیت کے جوہرنمایاں ہوتے ہیں اوراس کے نقص وکمال کا اندازہ دنیا کو ہوتا ہے۔پیاؔم نے ماں کی محبت کواس طرح واضح کیا ہے ؎

پیار سب کرتے ہیں دنیا میں تجارت کے لئے
صرف اک ماں کی محبت ہے محبت کے لئے

مشکلیں سہہ کے ہمیں درس وفا دیتی ہے   شب کے سناٹے میں اٹھ اٹھ کے دعا دیتی ہے
خون دل اپنا یہ ہنس ہنس کے پلا دیتی ہے   گوشت کے ٹکڑوں کو انسان بنا دیتی ہے
مامتا ماں کی وہ دولت ہے جو گھٹتی ہی نہیں
باپ تھک جاتا ہے ماں پیار سے تھکتی ہی نہیں

ماں کی آغوش ہے وہ مکتبۂ فکر و نظر   پیار کے ہاتھ جہاں کرتے ہیں تعمیر بشر
ظلمتیں آ کے جہاں بنتی ہیں انوار سحر   مثل اسماء یہ بنا دیتی ہے ذرے کو گہر
اپنی اولاد کی تقدیر بدل دیتی ہے
باپ کے خون کی تاثیر بدل دیتی ہے

آخری انقلاب سماجیاتی مطالعے کے اعتبار سے پیاؔم کا ایک اوراہم مرثیہ ہےجس میں انہوں نے آج کے دور کے حساس ترین موضوع انقلاب کے تصور کوایرانی انقلاب کے پس منظر میں پیش کرتے ہوئے ملت اسلامیہ کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے موجودہ عہد کے مطالبات کے پیش نظر یہ مرثیہ اسلامی سماج کو باطل طاقتوں سے لڑنے کا جذبہ وحوصلہ عطا کرتا ہےاور مسلم سماج میں مشاہیر اسلام سے عقیدت واحترام کے جذبوں کوابھارتا ہےاور ان سے کسب فیض کے لئے آمادہ کرتا ہے۔

جدید مرثیہ نگاروں کی نئی نسل میں سید نوشہ رضاؔ سرسوی کا نام کسی تعارف کامحتاج نہیں وہ اب تک ایک درجن سے زائد مرثیئے کہہ چکے ہیں جس میں نماز قابل ذکر مرثیہ ہے۔گزشتہ دہائیوں سے شیعہ حلقوں کے کم سواد افراد نماز وعزاداری کے تقابل کے معاملے میں الجھے ہوئے ہیں ان میں کچھ تو وہ ہیں جو اپنی کم علمی کے سبب نماز کی اہمیت کے نام پر عزاداری کوختم کرنے کی سازش کا شکار ہو رہے ہیں تو کچھ عزاداری کے نام پر نماز کی قربانی دینے کے لئے آمادہ ہیں یہ دونوں گروہ افراط وتفریط کا شکار ہیں رضاؔ سرسوی نے ان دونوں پہلوؤں کونہایت جامعیت کے ساتھ اپنے اس مرثیئے میں واضح کیا ہے ملاحظہ ہوں اس مرثیئے کے ابتدائی چند بند:

نماز صاحب ایمان کی علامت ہے   نماز پنجتن پاک کی وصیت ہے
تمھیں نماز کی فرصت نہیں قیامت ہے   نماز سیّد مظلوم کی امانت ہے

سر حسینؑ جو خاک شفا سے ہٹ جاتا
گلا نماز کا کرب و بلا میں کٹ جاتا

بنا نماز کے کافی نہیں ہیں حج و زکواۃ　　بنا نماز کے ملتی نہیں ہے راہ نجات
نماز دیتی ہے انساں کو باوقار حیات　　نماز بخشتی ہے دل کو عزم و ثبات
پڑھی نماز تو مومن کے دل کو چین ملا
نماز ہی سے شعور غم حسینؑ ملا

شعور دیں ہے نماز اور دین ہیں شبیر　　دل حسینؑ کی دھڑکن ہے نعرۂ تکبیر
نماز کرتی ہے فکر و خیال کی تطہیر　　رکھا جو خاک پہ سر اور بڑھ گئی توقیر
نماز پڑھ کے جو یاد حسینؑ آتی ہے
تو آنکھ نذر کو اشکوں کے پھول لاتی ہے

اس کے بعد رضا سرسوی نے ارکان نماز سے جو سبق ملتے ہیں ان کا بیان اپنے مرثیہ میں جس طرح کیا ہے وہ بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے چند بند ملاحظہ کیجئے۔

وضو ہے یعنی دلوں کو حسد سے پاک کرو　　قیام کہتا ہے قائم صراط حق پہ رہو
رکوع بولا کہ ماں اور پدر سے جھک کے ملو　　صدا یہ دیتا ہے سجدہ کہ خاکسار بنو
چھری کے نیچے جو جلتی زمیں پہ چین سے ہے
نماز باقی اسی سجدۂ حسینؑ سے ہے

نماز کیا ہے بتائیں گے کربلا والے　　پڑے ہوئے تھے جہاں لاالہ کے لالے
نماز روکنے نکلے تھے خنجر و بھالے　　بچایا سجدہ کو اپنے گلے کٹا ڈالے
وہ زیر تیغ شہ مشرقین کا سجدہ
فرشتے دیکھنے آئے حسینؑ کا سجدہ

ملے نہ ایسے نمازی کہیں زمانے میں　　ملے ہیں جیسے کہ زہراؑ ترے گھرانے میں
جو قتل ہو گئے اسلام کو بچانے میں　　نشان سجدوں کے چھوڑ آئے قید خانے میں
خدا کے گھر کا ہر اک احترام کرتا ہے
مگر حسینؑ کو کعبہ سلام کرتا ہے

بدن پہ زخم ہزاروں زباں پہ شکر خدا　　وہ ضعف تھا کہ لرزتا تھا جسم کا سایہ
اجل کے سینے پہ یوں کی نماز عصر ادا　　گلا کٹا تو کہا لا الہ الا اللہ

عبادتوں کا مقدر یہ ایک سجدہ ہے
ہلاک ہو گئے قاتل نماز زندہ ہے

سید بادشاہ حسین رمزؔ لورپوری ایسے مرثیہ گو تھے جو نام ونمود اور شہرت ومقبولیت کی فکر سے بے نیاز ہو کر اس صنف سخن کی آبیاری میں مصروف رہے انہوں نے کبھی ان مرثیوں کی اشاعت کی جانب توجہ نہ کی، وہ لورپور اور متوپور کے امامباڑوں میں محرم کی بعض تاریخوں میں مرثیہ پڑھتے تھے جن میں راقم کو بھی شرکت کی سعادت نصیب ہو چکی ہے۔ان کے ایک مرثیہ کے کچھ بند ماہنامہ العلم بمبئی کے مرثیہ وسلام نمبر ۱۹۹۳ء میں شایع ہو چکے ہیں۔رمزؔ کے مرثیے تاسی سیرت وکردار کے اعتبار سے کامیاب مرثیے کہے جاسکتے ہیں اس لئے کہ رمزؔ نے سماج میں اخلاقی قدروں کے احیاء کے لئے ان کی نشر و اشاعت ماضی کے حوالے سے کی ہے اور جگہ جگہ ذہن کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے امام حسین کے حال کا مرثیہ'انساں کی معرفت ہو بشر کو تو خوب ہے' کی ایک بیت ملاحظہ فرمائیں جس میں رمزنے انسان کی خالق سے بے تعلقی وناشکری پر نہایت خوبصورت انداز میں تبصرہ کیا ہے۔

مخلوق ہو کے کرتے ہیں خالق سے انحراف کھا کھا کے رزق ہے جنھیں رازق سے انحراف

رمزؔ کے ایک مرثیے کے درج ذیل بند بھی ملاحظہ کیجئے جن میں وہ انسان کو خود شناسی کی منزل پر لانا چاہتے ہیں اس لئے کہ یہی عرفان ذات عرفان الٰہی کی پہلی منزل ہے جس کے بعد انسان ایک بہتر اور اچھے سماج ومعاشرہ کی تشکیل میں کامیاب ہوگا اس لئے کہ عرفان ذات وعرفان الٰہی کے بعد انسان حقوق وفرائض کی ادائیگی کے لئے ہر لحہ متفکر رہے گا اور نتیجہ میں اسلام کا مثالی معاشرہ وجود میں آئے گا:

انسان کے مقام سے واقف بشر نہیں پہنچا وہاں جہاں کہ ملک کا گزر نہیں
دولت ہیں عقل و علم و عمل مال و زر نہیں لازم ہے اپنی معرفت اس سے مفر نہیں
کبر و غرور حق کو زبس نا پسند ہے
جو اپنی حد سمجھ لے وہی عقل مند ہے

رمزؔ نے اپنے مرثیوں میں انسان کے فطری جذبات کو حداعتدال میں رکھنے کے لئے اکثر ایسے افراد کا بھی تذکرہ کیا ہے جو خواہشات کی افراط و تفریط کے نتیجے میں ہمارے لئے واقعۂ عبرت بن گئے۔

مہلت جو عیش کرنے کی ملتی ہے دو گھڑی اپنے کو بھول جاتا ہے دم بھر میں آدمی
حق سے وہ منھ پھراتا ہے بڑھتی ہے جب خودی نمرود بن کے کرتا ہے خالق سے ہمسری
نخوت بھری ہے سر میں فراست ذرا نہیں
وہ مشت خاک کیا جسے خوف خدا نہیں

جدید مرثیے کی تاریخ میں سید شمیم حیدر شمیمؔ امروہوی کا نام محتاج تعارف نہیں اب تک ان کے متعدد مرثیے رسائل وجرائد میں شائع ہو چکے ہیں اس کے علاوہ انتساب فضہ اور انیس سو بیاسی منظر عام پر آچکے ہیں شمیمؔ کے مرثیوں میں سب سے اہم مرثیہ وہ ہے جو انہوں نے جناب فضہ کے حال میں کہا ہے جس کا مطلع ہے'ذہن میں جب بھی کنیزی کا خیال آتا ہے' شمیمؔ کا یہ مرثیہ نہایت اچھوتا اور انوکھا ہے اس لئے کہ اس کے چہرے میں انہوں نے کنیزی اور غلامی کے تصور کو پیش کیا ہے۔

رثائی ادب کے ممتاز ناقد اور امروہہ کی رثائی وادبی تاریخ کو حیات دوام عطا کرنے والے جدید مرثیہ گو عظیم امروہوی کے نام سے برصغیر کا رثائی حلقہ بخوبی واقف ہے مرثیہ کے نقادوں نے ان کے مراثی کی جو تفصیلات درج کی ہیں اس کے پیش نظر ان کے مراثی کی تعداد دو درجن سے زائد ہے ان کے مراثی کی تفصیلات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اختصار پسندی کی روایت ان کو بہت مرغوب ہے۔

انہوں نے اپنے مرثیے حسین اور اتحاد کی تمہید میں اتحاد کی ضرورت، اتحاد میں پوشیدہ طاقت اور اتحاد کی اہمیت کو مظاہر کائنات کے ذریعے پیش کرنے کی قابل تعریف سعی کی ہے:

اجزائے زندگی کا اگر کیجئے تجزیہ انسان دیکھنے میں جو پتلا ہے خاک کا
شامل ہے اس میں آب کہ جس سے ملی بقا آتش بھی ہے شریک تو شامل بھی ہے ہوا
ان سب کے اتحاد کا ہے نام زندگی
ہوں منتشر تو موت کا پیغام زندگی

آب بقا کا ایک سمندر ہے اتحاد انسان کی فلاح کا رہبر ہے اتحاد
امن و سلامتی کا پیمبر ہے اتحاد عزت فقط وہاں پہ ہے جس گھر ہے اتحاد
قائم نظام کون و مکاں اس کے دم سے ہے
بوڑھا بھی ہے کوئی تو جواں اسکے دم سے ہے

قائم ہے زندگی کی بہار اتحاد سے بڑھتا ہے آدمی کا وقار اتحاد سے
دشمن کے دل میں چبھتا ہے خار اتحاد سے کشتیٔ قوم ہوتی ہے پار اتحاد سے
جو قوم متحد ہے وہ بیدار ہو گئی
جو منتشر ہوئی ہے وہی خوار ہو گئی

اتحاد سے علاحدگی کے نتیجے میں سماج ،قوم اور ملت اختلاف وانتشار کا شکار ہوتی ہے اور یہ اختلافات وانتشار مزید برائیوں کو جنم دیتے ہیں عظیم اس پہلو کو بھی ماہ وسال کے آئینے میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ انسان متأثر ہوئے بغیر نہیں رہتا مثال کے طور پر ان کے مرثیہ کے درج ذیل بند دیکھئے ۔

جب جب بھی اتحاد پہ آیا کہیں زوال تاریخ ہے گواہ کہ جینا ہوا محال
حرف سیاہ بن گئے انساں کے ماہ و سال اس دور کے سماج کا بگڑا کچھ ایسا حال
جب آدمی کا خون بھی بے بھاؤ بہہ گیا
خود آئینے سے آئینہ ٹکرا کے رہ گیا

کمزور اور غریب کا جینا ہوا حرام ہر سو ہر اک دیار پہ چھائی غموں کی شام
غیرت کے ہر مقام پہ بے غیرتی تھی عام تھا کوئی تشنہ لب تو رہا کوئی تشنہ کام

آباد جو مقام تھا ویران ہو گیا
شیطان آدمی سے پشیمان ہو گیا
انسانیت بکھر گئی انسان لٹ گیا سچائی ختم ہو گئی ایمان لٹ گیا
رہبر بھٹک گیا تو نگہبان لٹ گیا آپس کی پھوٹ ہی سے مسلمان لٹ گیا
دنیا تمام وادیٔ ظلمات ہو گئی
دن تو نہیں چھپا تھا مگر رات ہو گئی
کتنے اس اختلاف سے مسمار ہو گئے باکار بھی جو تھے تو وہ بے کار ہو گئے
عزت گئی ذلیل ہوئے خوار ہو گئے آخر زمیں کے سینے پہ اک بار ہو گئے
اس اختلاف سے جو تباہی ہے دیکھئے
بھائی نے ٹانگ بھائی کی کھینچی ہے دیکھئے

تصویر کے دونوں رخ اتحاد و اختلاف کا منظر نامہ پیش کرنے کے بعد وہ اپنے تخاطب کو صرف امت مسلمہ تک محدود کرتے ہوئے احکامات الٰہی کا بیان کرتے کرتے واقعہ کربلا تک پہنچتے ہیں اس لئے کہ کرب و بلا وہ منزل اتحاد ہے جہاں عربی و غیر عربی، آزاد و غیر آزاد، قرشی و غیر قرشی، مطلبی و غیر مطلبی اور ہاشمی و غیر ہاشمی میں کوئی تفریق نہیں ہے ۔

نعرہ ہر ایک غازی و صفدر کا ایک تھا
دل اور دماغ پورے بہتر کا ایک تھا
اکبر کے خوں میں جون کا خوں آ کے مل گیا کچھ فرق رنگ و نسل کا قائم نہ رہ سکا
ہر اک کے ساتھ شہ کا عمل ایک ہی رہا خون سیاہ سرخ لہو میں خود آ ملا
یوں کربلا میں اپنے سروں کو کٹا گئے
دنیا کو اتحاد کا رستہ دکھا گئے

عظیم نے اپنے مرثیۂ حسینؑ اور قرآن میں آپسی میل جول، اخوت، انسانی ہمدردی اور اتحاد کا درس دیتے ہوئے اپنی انسان دوستی، دین شناسی، عصری آگہی اور وسعت نظر کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

سید علی مہدی بلرام پوری کے مرثیوں میں بھی سماجی پہلوؤں کو پیش کرنے کا رجحان موجود ہے انہوں نے جون ۱۹۴۷ء میں پہلا مرثیہ کہا تھا اب تک ۳۶ مرثیے کہہ چکے ہیں ان کے دو مرثیے 'مجاہد اعظم' اور 'روداد غم' لکھنؤ سے شایع ہو چکے ہیں ان میں مؤخر الذکر مرثیے کی ابتداء ملت مسلمہ کی زبوں حالی کے بیان سے ہوتی ہے جس میں شاعر کا قومی درد صاف جھلکتا ہے:

ہائے افسوس گناہوں میں گرفتار ہیں ہم بند آنکھیں ہیں مگر ناز کہ بیدار ہیں ہم
دین سے کہدو کہ دنیا کے پرستار ہیں ہم مردنی چھائی ہوئی قوم کے بیمار ہیں ہم

درد بڑھ بڑھ کے یہ کہتا ہے دوا کیا ہوگی
جان دینے کی تمنا ہے شفا کیا ہوگی
دل میں کچھ شوق عبادت ہے نہ ذوق ایماں
جن پہ بیداریاں نازاں ہوں وہ آنکھیں ہیں کہاں
صبح کے وقت سماعت پہ گزرتی ہے گراں
خانۂ حق سے ابھرتی ہوئی آواز اذاں
جتنا کھویا ہے ہمیں اس سے سوا کھونے دے
اے مؤذّن نہ جگا اور ابھی سونے دے
خود نہ اپنے کو مٹائیں تو سنور جائیں ہم
اہل کردار کہیں لوگ جدھر جائیں ہم
مسکراتے ہوئے منزل سے گزر جائیں ہم
حق پہ بات آئے تو حق بات پہ مر جائیں ہم
بات پستی کی نہ ہو رفعت کردار کی ہو
دل ہو حیدر کا زباں میثم تمّار کی ہو

سیدمحمودحسن قیصؔر پیشہ کے اعتبار سے لائبریرین تھے رام پور اورعلی گڑھ کے زمانۂ قیام میں کلاسیکی اور جدید مرثیہ کی تفاوت کا مکمل شعور پیدا ہوا اورانہوں نے مرثیے کہنے شروع کئے۔ان کے مرثیوں میں لب ولہجہ کی جدت،فکر کی تازگی اورعصری حسیت کا امتزاج ملتا ہے۔وہ زندگی کو حرکت وعمل سے عبارت سمجھتے ہیں اسی لئے وہ دعوت انقلاب کو عام کرنے کی فکر میں منہمک نظر آتے ہیں۔ملاحظہ ہوں ان کے ایک مرثئے کے درج ذیل بند۔

اے وقت چاہیئے کوئی پھر تازہ انقلاب
طاری ہے ذرے ذرے میں آشوب و اضطراب
ہے تیز نبض دہر عناصر میں پیچ و تاب
برہم ہے طبع آتش و خاک و ہوا و آب
کرب الم سے زرد ہے چہرہ حیات کا
دھارا ہے تیز قہر کی خونیں فرات کا
لرزہ بدل ہے ساعت میدان گیرو دار
نکلا ہے کون تیغ بکف بہر کارزار
رخت و زرہ، مشیت رب، تیغ ذوالفقار
عزمِ علیؑ، ثبات نبیؐ، قصد کردگار
ڈر ہے کہیں بساط زمانہ سمٹ نہ جائے
ساتھ آستیں کے تختۂ گیتی الٹ نہ جائے
وہ شب کہ پھیلی ہوئی تھی ضیائے ماہ منیر
فروغ نور سے تھا بخت تیرگی دلگیر
پر ایک ذرہ تھا صمت و سکوت کی تصویر
فضا سے گرتی تھی چھن چھن کے ماہ کی تنویر
محیطِ دشت، تجلّی تھی ریگ زاروں کی
ہجومِ نور میں گم تھی ضیاء ستاروں کی

جدید مرثیہ نگاروں کی فہرست میں سید محمد کمال الدین جلالوی کا نام رثائی حلقوں کے لئے نیا نہیں ان کا مجموعہ فکر نجات کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے جس میں پانچ مرثیوں کے علاوہ دیگر رثائی اصناف بھی شامل ہیں ان کا دوسرا مرثیہ اس اعتبار سے توجہ کا مستحق ہے کہ اس میں کمال نے نماز کی فضیلت بے تکلفانہ انداز میں بیان کی ہے وہ ناصح مشفق یا واعظ بننے کی سے حتی الامکان بچتے ہیں۔

کمال کا تیسرا مرثیہ نہایت مختصر ہے صرف ۳۶ بندوں کا یہ مرثیہ اختصار کے باوجود انفرادیت کا حامل ہے اس میں انہوں نے آنسوؤں کے طبی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور مطلع ہی سے موضوع کے بیان کے لئے فضا ہموار کی ہے 'دنیا میں ہم آئے ہیں تو رونا ہے ضروری' کہہ کر یہ واضح کرنے کی بھی کوشش کی ہے کہ رونا فطرت بشری کا ایک اہم جزو ہے۔ یہ انسان کی فطرت میں قدرت نے کیوں رکھا اور اس کے اسباب وعلل کیا ہیں ان کی وضاحت وصراحت ذیل میں ملاحظہ ہو۔

عالم کے جو ہر فعل پہ ہے قادر و یکتا   ہر شئے کی حقیقت کا جو ہے عالم و دانا
حکمت سے نہیں امر کوئی اس کا مبرّا   بے فیض کوئی وصف کسی کو نہیں بخشا
انساں کو دیا رنج تو رونے کی صفت دی
اور اشک سے ہر رنج کو دھونے کی صفت دی

جو روتا ہے انساں اسے غم کھا نہیں سکتا   درد و الم و رنج اسے پا نہیں سکتا
گر روئے نہ انسان تو صبر آنہیں سکتا   حق یہ ہے کہ صدمہ کا اثر جا نہیں سکتا
گریہ غم و اندوہ کی بے مثل دوا ہے
صدمہ جو ہو لاحق تو یہ تدبیر شفا ہے

رنج و غم و آفت ہے تو گریہ ہے ضروری   لاحق جو مصیبت ہے تو گریہ ہے ضروری
احباب کی الفت ہے تو گریہ ہے ضروری   اور عشق و محبت ہے تو گریہ ہے ضروری
بے حس ہے جسے درد کا احساس نہیں ہے
رشتوں کے تقاضے کا اسے پاس نہیں ہے

شامل ہو تضرع بھی جو انساں کی دعا میں   ہوجاتی ہے مقبول یہ درگاہ خدا میں
کم ہوتا ہے اس سے ہر اک جور و جفا میں   ملتا ہے سکوں قلب کو اندوہ و بلا میں
بالواسطہ گریہ بھی مسرت کا سبب ہے
ہر ایک مصیبت میں یہ راحت کا سبب ہے

پروفیسر منظر عباس نقوی نے بھی جدید طرز کے مرثیے کہے ہیں مگر راقم کو ان کا ایک مرثیہ پنجۂ علم ہی فراہم ہوسکا اس میں پروفیسر منظر عباس نے ہاتھ کو موضوع بنا کر گفتگو کی ہے۔ مرثیہ کی تمہید میں انہوں نے انسانی زندگی میں ہاتھوں کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے ان ہاتھوں نے ایجادات کی دنیا میں جو کارنامے انجام دیئے ہیں اس کی جھلک اس طرح پیش کی ہے

کھودی زمین اناج اگائے اس ہاتھ نے　　صحراؤں میں گلاب کھلائے اس ہاتھ نے
جنگل جہاں تھے شہر بسائے اس ہاتھ نے　　کیا کیا نہ معجزات دکھائے اس ہاتھ نے
انسان کو طیور کا دمساز کر دیا
بے بال و پر کو ماہر پرواز کر دیا
سر پر جو ہو یتیم کے شفقت یہ ہاتھ ہے　　کمزور کو بچائے تو طاقت یہ ہاتھ ہے
کام آئے بیکسوں کے تو ہمت یہ ہاتھ ہے　　دے بے سوال اگر تو سخاوت یہ ہاتھ ہے
بخشش کا لطف اس میں ہے واقف بشر نہ ہو
اک ہاتھ دے تو دوسرے کو کچھ خبر نہ ہو
چکی چلائیں، روٹی پکائیں، کھلائیں ہاتھ　　کھانے کو کچھ نہ ہو تو تھپک کر سلائیں ہاتھ
بچے پڑھیں نماز تو لے لیں بلائیں ہاتھ　　دیتے رہیں نوافل شب میں دعائیں ہاتھ
اک دن خموش پاکے جو بچے مچل پڑیں
دو ہاتھ مامتا کے کفن سے نکل پڑیں
اور وہ جو کربلا میں ہوا ایک سانحہ　　وہ بھی تو ہاتھ ہی کا تھا سارا معاملہ
یعنی بنا امیر جب ابن معاویہ　　بیعت کا تھا حسینؑ سے فوری مطالبہ
شہ بولے اس امیر کی بیعت روا نہیں
اللہ اور رسولؐ کو جو مانتا نہیں
وارث ہوں میں جہاں میں خدا کے رسول کا　　فرزند ہوں علیؑ کا پسر ہوں بتولؐ کا
میں جانشین ہوں حسنؑ دل ملول کا　　میں ہی تو پاسبان ہوں دیں کے اصول کا
کس طرح ایک دین کے دشمن کا ساتھ دوں
ممکن نہیں کہ ہاتھ میں اس کے میں ہاتھ دوں

انکار بیعت کے نتیجہ میں امام حسینؑ کے سامنے پیش آنے والی صورت حال کا بیان منظؔر عباس نقوی نے جس طرح کیا ہے اس سے سماج و معاشرے کے افراد میں باطل طاقتوں کے سامنے سینہ سپر ہونے کا عزم وحوصلہ پیدا ہوتا ہے۔

ہوں قتل میرے خویش و اقارب تو غم نہیں　　کھائے سناں جو سینے پہ اکبر تو غم نہیں
تڑپے لہو میں ہاتھوں پہ اصغر تو غم نہیں　　لاشے سبھوں کے دیکھوں زمیں پر تو غم نہیں
منظور ہے جو نوک سناں پر یہ سر رہے
اسلام کا وقار سلامت مگر رہے

جو کچھ کہا حسینؑ نے کر کے دکھا دیا میدان کربلا میں بھرا گھر لٹا دیا
مفہومِ لاالٰہ جہاں کو بتا دیا شاہی کو جان دے کے سبق یہ سکھا دیا
ہٹتے نہیں ہیں ہم کبھی اپنے اصول سے
بیعت طلب نہ کیجیو آل رسول سے

مہدی نظمی کی شہرت کے پس پشت ان کی رثائی شاعری کارفرما رہی ہے یوں تو انہوں نے جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ان کی شاعری کے متعدد مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔مظلوم کربلا کے عنوان سے ان کے مراثی بھی منظر عام پر آ چکے ہیں جن کے مطالعے سے بآسانی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کلاسیکی مرثیے کے اجزائے ترکیبی کا لحاظ رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود وہ زمانے کی بدلتی قدروں سے آشنا ہیں اس لئے ان کے یہاں فکری و فلسفیانہ موضوعات کی کمی نہیں ان کے دل میں انسانی درد کا احساس زندہ ہے نتیجہ یہ ہے کہ روئے زمین پر کہیں بھی ظلم ہو ان کے دل میں نوک خار کی طرح چبھتا ہے اس کی جھلک ان کے مرثیوں میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔

اے خدا شر کے بگولے خون برسانے کو ہیں آدمی کی زندگی میں زلزلے آنے کو ہیں
جوہری طاقت کے فتنے چہرہ دکھلانے کو ہیں کہکشاں کی مانگ کے تارے بکھر جانے کو ہیں
جنگ بازوں کی سواری پہنچی ہے افلاک پر
اب گھٹا برسے گی دود جوہری کی خاک پر

اشتراکی اور جمہوری نظاموں کا فساد آدمی کے خون میں ڈوبے پیاموں کا فساد
راتوں سے پہلے شفق آلود شاموں کا فساد برتری کی پیاس میں دو تشنہ کاموں کا فساد
ہل چلیں ہیں بے کلی ہے خوف ہے ہیجان ہے
موت کی برسات ہے سہا ہوا انسان ہے

وہ ہوا و حرص کے میدان میں زرداروں کی دوڑ وہ فلک پر جوہری طاقت کے طیاروں کی دوڑ
وہ ستم ایجاد دانائی وہ ہتھیاروں کی دوڑ وہ خلا کی کھوج کرنے والے سیاروں کی دوڑ
مٹ نہ جائے خاک سے نام و نشان زندگی
رہ گزار مرگ میں ہے کاروان زندگی

مہدی نظمی کے نزدیک یہ جنگ انسان کی انسان سے نہیں ہے بلکہ دو افکار و نظریات کی جنگ ہے ہر ایک دوسرے پر فوقیت و برتری چاہتا ہے جس کے نتیجہ میں دنیا کے تمام عوام آنے والی تباہی کے خوف سے لرزاں ہیں دیکھئے وہ کس طرح اپنی فکر کو مرثیے کے سانچے میں ڈھال کر عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

ہے ستاروں کی بلندی پر تصادم کا خیال شیشۂ خلقت ہے نازک پڑنے ہی والا ہے بال
بننے والا ہے خلا دامان میدان جدال چاند میں ہوگی لڑائی کہکشانوں میں قتال

سازش ابلیس ہے آزار دینے کے لئے
بدلہ آدمؑ کا بنی آدم سے لینے کے لئے

مہدی نظمی نے دنیا کو آنے والی تباہی سے بچانے کے لئے کربلا کے واقعہ سے امن و آشتی کا جو درس دیا ہے وہ اس لئے نہایت اہم ہے کہ جب تک ہم اس راستے پر گامزن نہ ہوں گے تب تک دنیا روز اک نئے خطرے سے دو چار ہوتی رہے گی:

کربلا سے درس علم و آگہی انسان لے　　قیصر جمہور کے بازو کی قوت مان لے
یہ نئی دنیا حسینؑ ابن علی کو جان لے　　انقلاب فکر کی تحریک کو پہچان لے
موج دریا پھوٹ نکلے تشنگی کے ساز سے
جنگ کا نعرہ دبا دو امن کی آواز سے

اپنی نظامت کے منفرد انداز کی بناء پر مشاعروں اور مقاصدوں کی دنیا میں پہچان بنانے والوں میں ایک اہم جدید مرثیہ نگار بھی شامل ہے میری مراد ناشرؔ نقوی سے ہے۔ ناشر نے اپنا پہلا مرثیہ ۱۹۷۸ء میں تشنگی کے عنوان سے کہا تھا اب تک ان کے نصف درجن سے زائد شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں ان میں لالہ زار صبح ان کے مرثیوں کا مجموعہ ہے جس میں سات مرثیے شامل ہیں جن کے عناوین قلم کی شہادت، وجدان، ادراک، تشنگی، احساس اور عباس، تبسم کی ذوالفقار اور محبوب وغیرہ ہیں میرے مقالے کی اشاعت سے قبل انہوں نے اپنے ایک اور مجموعۂ مراثی بہ عنوان دیدہ وری کی اشاعت کی ضبر دی تھی مگر میری غیر ادبی مصروفیات کے سبب وہ ہم دست نہ ہو سکا۔

ناشرؔ نے 'وقت، ہم اور حسینؑ' میں وقت کی اہمیت کو محسوس کیا ہے اور وقت کو موضوع بنا کر قوم میں جذبۂ حرکت و عمل بیدار کرنے کی کوشش کی ہے وہ اس مرثیہ میں عظمت ماضی کا ترانہ چھیڑ کر یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم آج بھی وقت کے رخ کو تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اس لئے کہ ہم ہی وہ ہیں جن کے اشاروں پر نظام شمس و قمر میں انقلاب برپا ہوا تھا۔

وقت کو نام و نمود نشو و نما ہم سے ملی　　وقت کو عزت و معراج و ادا ہم سے ملی
وقت کو تیرگیٔ شب میں ضیاء ہم سے ملی　　وقت کو جاہ و حشم طرز جلا ہم سے ملی
وقت کی بات ہے جو مفلس و مظلوم ہیں ہم
حکمراں وقت ہے اور وقت کے محکوم ہیں ہم

وقت کچھ وقت میں تکمیل ہوا کرتا ہے　　وقت اقدار کی تعمیل ہوا کرتا ہے
وقت حالات کی ترسیل ہوا کرتا ہے　　وقت ہر دور میں تبدیل ہوا کرتا ہے
وقت واقف ہے کہ ہم جب بھی دعا کرتے ہیں
مہر اور ماہ اشاروں پہ چلا کرتے ہیں

وقت کے ظلم کی تاریخ اٹھا کر دیکھو　　اب بھی شیطان کے ہاتھوں میں ہے خنجر دیکھو
نار نمرود میں توقیر پیمبر دیکھو　　آج بھی ابھرا ہوا جبر کا ہے سر دیکھو

اپنے اندازوں سے یہ راہ عمل لیتا ہے
وقت ہر دور میں چہرے کو بدل لیتا ہے

وقت میں وہم کہ اب ہم میں تکلم نہ رہا ہمتیں ٹوٹ گئیں موج ترنم نہ رہا
ماتمی لوگوں میں اب جوش و تلاطم نہ رہا دیدہ ور ختم ہوئے آنکھوں میں اب غم نہ رہا
وقت کے زعم کو آج اٹھ کے مٹانا ہوگا
اب بھی ہم وقت کے فاتح ہیں بتانا ہوگا

ہم علیؑ والے ہیں خود دار و تونگر ہم ہیں فاتح وقت ہیں تاریخ کا منظر ہم ہیں
آنکھ کی پیاس بجھا لو کہ سمندر ہم ہیں ہیبتیں جن کی ہیں قائم وہی لشکر ہم ہیں
مٹ نہیں سکتے کسی جبر سے آزار سے ہم
قافلے روک دیا کرتے ہیں انکار سے ہم

اور کہیں وہ اپنے عہد کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے موجودہ دنیا کی صورت حال اس طرح پیش کرتے ہیں کہ مسائل ومصائب کے ساتھ ساتھ ان کا حل بھی ہمیں مل جاتا ہے:

مطلب پرستیوں میں ہے دنیائے رنگ و بو دامان دیں کو آج ہے پھر حاجت رفو
قرآں شکستہ جسم ہے ایماں لہو لہو خطرے میں پھر ہے دین محمدؐ کی آبرو
اب سن بھی لے یہ درد میں ڈوبی صدا حسینؑ
پھر عصر نو پکار رہا ہے کہ یا حسینؑ

قصبات اودھ میں زید پور کی اہمیت سے اردو ادب کے ماہرین بخوبی واقف ہیں یہیں کی ایک محترم ہستی ناصؔر زید پوری ہیں جنہوں نے تعلیم کے بعد حیدرآباد کا رخ کیا اور وہیں کے ہو رہے ناصؔر نے سو کے قریب مرثیے کہے ہیں جن کی اشاعت کی ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ہے کچھ غیر مطبوعہ مراثی میرے عزیز دوست ساجد رضوی زید پوری کے برادر بزرگ رضا عابد کے توسط سے مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا جن کے مطالعے کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ مرثیے سے تبلیغ واصلاح معاشرہ کا کام لینا چاہتے تھے اس لئے انہوں محمد وآل محمد کی حیات طیبہ کے ان نقوش کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے جن کی تاسی و پیروی عصر حاضر میں ملت اسلامیہ کے لئے مشعل راہ ثابت ہو سکتی ہے انہوں نے اہل بیت کے ملکوتی صفات کے ساتھ ساتھ بشری صفات جیسے زراعت و باغبانی وغیرہ امور کی طرف بھی توجہ دی ہے تا کہ کمزور و مستضعف افراد میں پائے جانے والے احساس کمتری کو ختم کر کے پس ماندہ انسانیت کو اوج ورفعت سے ہم کنار کیا جا سکے۔

نظیؔر باقری کا نام مقاصدوں اور مسالموں کے توسط سے رثائی حلقوں میں شہرت کے بام عروج پر ہے انہوں نے ۱۹۷۶ء میں پہلا مرثیہ ہنسی کے عنوان سے کہا تھا اب تک نصف درجن سے زائد مراثی کہہ چکے ہیں جن میں ہنسی، دست کائنات، حسن، چادر، اور اسیر کربلا شائع ہو چکے ہیں دست کائنات میں نظیر نے ہاتھوں کی نفسیات کو نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

ہندوستان میں جدید مرثیہ کا معتبر ترین نام پروفیسر وحید اختر کا ہے۔ پروفیسر موصوف اپنی وفات ۱۵ردسمبر ۱۹۹۶ء سے قبل تک ایک درجن سے زائد مرثیے کہہ چکے تھے اوران کی حیات میں ہی ان کے مرثیوں کا ایک مجموعہ کربلا تا کربلا منظر عام پر آ گیا تھا جس میں ۸ مرثیے شامل ہیں صداقت کے چراغ کے عنوان سے ان کا ایک مرثیہ العلم بمبئی کے فروری ۱۹۹۳ء کے شمارے میں شایع ہوا تھا ڈاکٹر طاہر کاظمی نے اپنے مقالے میں ان کے ے مرثیوں کے ایسے مطلعے درج کئے ہیں جو کربلا تا کربلا میں شامل نہیں ہیں یہ مرثیے پیش نظر ہوں تب ہی فیصلہ ممکن ہوگا کہ یہ کربلا تا کربلا کے کسی مرثیہ میں مطلع بدل کر تو نہیں شامل کر لئے گئے۔

کربلا تا کربلا پر نظر کرتے ہی اس حقیقت کا احساس ہوجاتا ہے کہ وحید اختر کے مراثی ان کے ہم عصروں کے مقابل کافی طویل ہیں۔وہ فلسفہ کی دنیا میں تلاش وجستجو کی مختلف شاہراہوں پر گامزن رہے ہیں اسی لئے ان کے مرثیوں کی تمہید میں عموماً سماجی تنقید، پامال ہوتی ہوئی اسلامی، اخلاقی اورانسانی اقدار، ظلم وجبر کی ستیزہ کاریاں اور عالمی سطح پر مستضعفین کے استحصال واستعمار کی جوصورت حال ہے اس کا نقشہ پیش کرنے کا رجحان نظر آتا ہے۔

نام مجبوری و محرومی کا طاقت رکھا نام لوٹ اور تباہی کا حکومت رکھا
نام غربت کی زبوئی کا قناعت رکھا نام لا حاصلیٔ عیش کا قناعت رکھا
رہزن و سارق و خائن نے بنائے قانون
ظلم و سرمائے نے محنت کو سکھائے قانون

سائنسی ترقی کے منفی اثرات اور تباہ کن جنگی اسلحوں کی کثرت نے سماج ومعاشرے میں امن وسکون کی غارت گری کا جو ماحول تیار کیا ہے اس کا اظہار بھی ان کے مرثیوں میں جا بجا ہوا ہے 'شہید عطش' کی تمہید کا یہ حصہ دیکھئے۔

یہ عہد پر آشوب کہ ہم کو جو ملا ہے اس بانیٔ بیداد کا انداز نیا ہے
دن نکلے تو معلوم ہو دل ڈوب رہا ہے شام آئے تو بجھتا ہوا مرقد کا دیا ہے
ہر ایک نفس عمر عذاب دو جہاں ہے
دھڑکن بھی مزاج دل نازک پہ گراں ہے

اک سمت یہ پرواز ترقی ہے بشر کی ہے قبضۂ قدرت میں عناں شمس و قمر کی
افلاک میں ہے دھوم زمیں زاد نظر کی منت نہیں درکار دعاؤں کو اثر کی
ہر عقدۂ تقدیر جہاں کھلنے لگا ہے
خورشید بھی ہم وزن خزف تلنے لگا ہے

اور دوسری جانب ہیں غم زیست کے سائے اندیشۂ جاں سے نہ یہاں نیند بھی آئے
اس آگ کے طوفاں میں کوئی چین نہ پائے آنکھوں کیلئے خواب بھی اپنے ہیں پرائے
ذرے کا بھی دل ٹوٹے تو ہل جاتی ہے دنیا
پرساں نہیں کوئی دل انساں کی تڑپ کا

ہے شعبدۂ مکر فن اہل سیاست بک جاتی ہے لٹ جاتی ہے افکار کی عصمت
ممنوع ہے معتوب ہے ذہنوں کی دیانت ممدوح ہے مرغوب ہے ایماں کی تجارت

یہ طرفہ ستم وقت نے ایجاد کیا ہے
ویران ہیں گھر روضوں کو آباد کیا ہے

گر کوئی کرے عظمت انساں کا سبق یاد آوارہ وطن ہوتا ہے وہ خانماں برباد
ہے فکر معاش اس کے لئے روز کی بیداد آئین فقیہان ہوس کرتا ہے ارشاد

تقدیس محبت کا بھی ذکر آنے نہ پائے
یہ شمع تہہ دامن فکر آنے نہ پائے

جو خواب بھی دیکھا وہ پریشاں نظر آیا اپنا جسے سمجھا وہ گریزاں نظر آیا
جس باغ کو سینچا وہی ویراں نظر آیا پوچھا جسے وہ چاک گریباں نظر آیا

جو ہے ستم دہر سے فریاد بہ لب ہے
کلیوں سے سبب چپ کا جو پوچھیں تو غضب ہے

ہر عہد کے بو جہل رہے صاحب دولت پائی ہے تہی ذہنوں نے وسعت پہ حکومت
اندھوں ہی کو مانا گیا ارباب بصیرت کم ظرفوں سے منسوب ہے حاتم کی سخاوت

کیوں اس کو ستم گاریٔ دنیا نہ کہیں ہم
جلادوں کے آگے ہیں نبیوں کے بھی سر خم

جو بھی سگ دنیا کی پرستش نہیں کرتا گھر اس کا زر ومال سے ہرگز نہیں بھرتا
جو حق کے لئے قید ستم سے نہیں ڈرتا ہر سانس پہ جینے کے لئے ہے وہی مرتا

کٹ جاتی ہیں اظہار صداقت میں زبانیں
دب جاتی ہیں بے معنی صداؤں میں اذانیں

اس صورت حال سے نبرد آزمائی لازمی ہے اس لئے کہ ہر رنگ کے ان یزیدوں سے جب تک نجات نہیں ملے گی دنیا عدل وانصاف سے پر نہیں ہوسکتی اور جب تک حق گوئی کا چلن عام نہ ہوگا اور عدل وانصاف کا قیام نہ ہوگا اس وقت تک تسخیر دوعالم کی منزل سر نہیں ہوسکتی۔

لازم ہیکہ اس دور کے فرعونوں سے ٹکرائیں واجب ہے کہ نمرودوں کے دوزخ سے گزر جائیں
مل جائے جو شدادوں کی جنت بھی تو ٹھکرائیں تخریب کو تعمیر کے آداب بھی سکھلائیں

ہر رنگ میں موجود یزیدان زماں ہیں
دنیا متلاشی ہے کہ شبیر کہاں ہیں

’صداقت کے چراغ‘میں بھی یہی اندازموجود ہے پامال ہوتی ہوئی انسانی اقدار کا منظر ملاحظہ کیجئے

کبھی روشن تھے جہاں عشق و محبت کے چراغ تھے جہاں راہ نما جرأت و ہمت کے چراغ
تھے جہاں نور فشاں شوق شہادت کے چراغ اب اگلتے ہیں اندھیرے وہیں دہشت کے چراغ
کو چۂ پیر فغاں جادۂ تنہائی ہے
اس طرف جام بکف آئے وہ سودائی ہے
در بدر پھرتے تھے جو کرتے ہوئے فکر معاش ریت کے ڈھیر میں جو کرتے تھے گندم کی تلاش
آج آنے نہیں دیتے ہیں وہ ہاتھوں پہ خراش روندتے ہیں قدم ظلم سے محنت کی لاش
روش سیدہ ٔ کون و مکاں بھول گئے
اسوہ ٔ فخر رسولان جہاں بھول گئے

پامال ہوتی اسلامی قدروں کے بیان کے بعد وحیداختر نے ماضی وحال کے پس منظر میں مسلمانوں اور یہودیوں کے عروج وزوال کا تقابل نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔وحیداختر نے موجودہ سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کی جومنظرکشی کی ہے اس کی تفصیل کا یہ مقالہ متحمل نہیں

جدیداردومرثیے نے سماج کے مختلف طبقوں کے مختلف مسائل ومصائب کی جوترجمانی کی ہے اورانسانیت کے گرتے ہوئے معیاراخلاق کو جس طرح بلندکرنے کی کوشش کی ہے گزشتہ اوراق میں اس کاایک خاکہ پیش کیاہے اس میں بہت سے نام ضخامت ومطالعے کی محدودیت کے سبب رہ گئے ہیں امید ہے کہ مستقبل میں اس طرف توجہ کی جائے گی اور جدیدمرثیہ جس طرح سماج ومعاشرہ کی خدمت کررہاہے اس کا حقیقی وواقعی اعتراف کیا جائے گا۔

☆☆☆☆☆

غضنفر کے افسانے 'خالی فریم' کا تجزیہ

ثروت خان

اسوی ایٹ پروفیسر شعبۂ اردو میرا گرلس کالج اودے پور

دائیں طرف	درمیان	بائیں طرف
چمک دمک–روشن	اندھیرا	روشن–چمک دمک
کئی ہاتھوں کی تصویریں، ہاتھوں میں تیر، تفنگ، تلوار، بندوق، بم، بارود یعنی تباہی کے لئے ہوشیار کر رہا ہے۔ درمیان کو دباریا بھاپ سے ڈرا رہا ہے۔ ہتھیار اور چمک دمک سے مرعوب کر رہا ہے۔	کوئی تصویر نہیں۔ خالی ہے یعنی زوال پذیر، بدرنگ، کمزور، مزدور، کسان محنت کش، جو دو پاٹوں کے درمیان پس رہے ہیں۔ جن کا ہونا نہیں ہونے کے برابر ہے۔	کئی عورتوں کی تصاویر : ہاتھوں میں لعل و گوہر، سیم و زر کی ہر انگلی میں ہیرے پنّے کی انگوٹھیاں جڑے نگینے اور ان میں شعاعیں پھوٹتی ہوئیں۔
دُخانی کھمبا............................... ایک گوشے میں ایک الگ تصویر بنی ہے جس کے چہرے پر تیج ہے اور جوت سے دمک رہی ہے مگر یہ اسی کھمبے سے بندھی ہے۔	سوالات : کیا اس فریم میں سے تصویر نکل گئی؟ یا بنائی ہی نہیں گئی۔ نکال لی گئی؟ نکل گئی؟ سبب؟ اس طرف کوئی کیوں نہیں دیکھتا؟	

سرسبز زمین یعنی **کُن فیکون** آباد کیا مگر انسان نے آلودہ کر دیا۔	پاؤں میں مرجھایا ہوا گجرا اور ایک ساز ٹوٹا ہوا پڑا ہے۔ یعنی موسیقی، فطرت، جمالیات، انسانیت، محبت کے بغیر زندگی میں نہ رس ہے نہ خوشبو، نہ رنگ ہے نہ سرور۔ ان کا انجام یہی ہے۔ بدن تاروں میں جکڑا، نہ تھرک سکے نہ اپنا وجود ثابت کر سکے۔ دھواں اور غبار کے باسی ہیں۔	یہ وہ طبقہ ہے جو ان دونوں کے دباؤں میں رہتا ہے۔ دباؤ اور اندھیرا علامت ہے استحصال، تباہی، ناقدری، بے توجہی کا شکار ہونا۔	اس کی طرف کوئی نہیں دیکھتا لیکن زیرِ بحث یہی فریم ہے۔ اس فریم کے اردگرد چمک دمک والے فریم دیکھ کر افسانے میں ایک کردار کو اپنے باغ کے ایک پیڑ کا ناگہانی ٹوٹ کر گر جانا یاد آنا۔ پھر پتہ لگا کہ اردگرد والے درختوں کی سخت جڑوں کے دباؤ میں وہ گر گیا۔ یہ بھی شاید سخت دباؤ میں ہے۔	پٹیاں، ہڈیاں، خون کے مٹ میلے چکتے، لوتھڑے، جھیلیں، تالاب کے شفاف پانی سے نکلتے شعلے۔ آتشیں گولے، سیاہ مرغولے یعنی تباہی
خوشحالی کی علامت مگر آلودگی بربادی کی علامت میں تبدیل	ٹاور یعنی بلندی، عروج تصاویر کی ماہیئت کو بڑھانے والے		ٹاور: بلندی، عروج، تصویروں کی ماہیئت کو بڑھانے والے۔	ٹاور یعنی بلندی، عروج تصویروں کی ماہیئت کو بڑھانے والے۔

دراصل یہ نقشہ غضنفر کے افسانے ''خالی فریم'' کے بطن سے ابھر کر سامنے آیا ہے۔جس میں تین ٹاور ہیں۔دائیں بائیں والے ٹاور باقاعدہ روشن اور چمکدار ہیں لیکن درمیان کے ٹاور کا فریم بالکل خالی ہے اوراس میں اندھیرا دکھایا گیا ہے۔ایک نمائش میں ایک مصور کی بنائی یہ تینوں تصاویر اونچے اونچے ٹاوروں پر فریم میں جڑی ہوئی لگی ہیں۔لوگ دیکھ رہے ہیں اوران کے متعلق اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے جارہے ہیں۔زیادہ تر بات درمیان والی فریم پر ہورہی ہے۔دو کردار ہیں جو دانشور قسم کے ہیں۔

افسانے کا آغاز ان جملوں سے ہوتا ہے :

''دائروں کینوس پر تین فلک بوس ٹاور...... کنارے کے دونوں ٹاوروں کے رنگ روغن روشن، درمیانی ٹاور چمک دمک سے خالی۔ ہر ایک ٹاور کے سینے پر ایک بڑا سا فریم۔ روشن ٹاوروں کے فریموں میں تصویریں آویزاں۔ دائیں جانب کے فریم کی تصویر کے کئی ہاتھ۔ ہر ایک ہاتھ میں ایک آلۂ حرب۔ کسی میں تیر، کسی میں تفنگ، کسی میں تلوار، کسی میں بندوق، کسی میں بم، کسی میں بارود۔

بائیں طرف کی تصویر سر سے پا تک سیم وزر اور لعل وگوہر سے مزیّن۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں انگوٹھیاں، انگوٹھیوں میں جڑے رنگ برنگے نگینے، نگینوں سے پھوٹتی شعائیں۔

بے رنگ اور بے رونق ٹاور کا فریم تصویر سے خالی۔ روشن ٹاوروں کے فریم کی تصویروں پر بہت ساری آنکھیں مرکوز۔ ان آنکھوں کی پتلیوں میں چاہ اور چمک۔ بے رنگ ٹاور کے خالی فریم کی طرف ایک بھی نگاہ مبذول نہیں۔''

پورا افسانہ پڑھنے کے بعد ذہن میں چند سوالات جنم لیتے ہیں:

(۱) دائیں بائیں والی تصویروں کی طرف سب کی آنکھیں مرکوز ہیں۔ان آنکھوں کی پتلیوں میں چاہ و چمک ہے، یعنی کہ ساری دنیا اِن اشیاء کو حاصل کرنے کی خواہش مند ہے، جو ان میں نظر آرہی ہیں۔اب چاہے وہ لڑ مر کر ہی کیوں نہ حاصل کی جائے۔غضنفر نے اسے افسانے میں ''رَوشِ دوراں'' کا نام دیا ہے تو کیوں؟

(۲) ٹاور کی بلندیاں تصاویر کی ماہیئت کو بڑھارہی ہیں۔درمیانی ٹاور میں اندھیرا ہے، کوئی تصویر بھی نظر نہیں آرہی ہے۔افسانہ نگار نے یہاں کئی سوالات اٹھائے ہیں، جو دیکھنے والے دانشوروں یا غور وخوض کرنے والوں کی گفتگو کے ذریعے افسانے میں مکالموں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ لُبِّ لباب یہ ہے کہ اندھیرے کے باسیوں کو سرے سے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ باقی دنیا یعنی اردگرد کے ٹاوروں میں رہنے والی دنیا کے باشندوں کے ذریعے ان کو ناقدری، ذلّت وخواری کے اندھیروں میں دھکیل کر ان کی نفسیات کے گہرے غاروں میں سینکڑوں گرہیں لگا کر ایسے اُلجھا دیا جاتا ہے کہ ان کے خیالوں کے طلسمی جنگل میں وہ بھٹکتے رہیں اور نجات کا راستہ بھی نہ ملے۔یعنی جو پسینہ بہائے، سخت محنت کرے اور دنیا اور دنیا والوں کو سجانے سنوارنے، ان کی آرائشوں، آسائشوں کے نت نئے ایجادات کو کثرت سے بنا کر مہیا کروانے میں اپنی ہستی لگادے وہ بلند نہیں بلکہ پست ہے اور جو پست ہیں انہیں عزت دینا ہے، آنکھوں پر بٹھانا، بلندی پر پہنچانا، دیکھنا دنیا کی ریت ہے۔آخر ایسا کیوں؟...... دیکھیے دو کرداروں کے یہ مکالمات :

''یار تیرا فریم خالی کیوں ہے؟ ایک نے اپنے پاس والے شخص کو مخاطب کیا۔

''ممکن ہے تصویر نکال دی گئی ہو............''

''نکل گئی ہو یا نکال دی گئی ہو............''

''ایک ہی بات ہے''

''کیا یہ ممکن نہیں کہ تصویر لگائی ہی نہ گئی ہو۔میرا مطلب ہے کہ اس کے لئے تصویر بنی ہی نہ ہو؟''

''نہیں، یہ ممکن نہیں۔فریم بنا ہے تو تصویر بھی ضرور ہوگی اور فریم کی زمین بتا رہی ہے کہ تصویر لگی بھی ہوگی۔''

''تصویر پھر نکال کیوں دی گئی؟''

''.......... یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ فریم سے نکل گئی ہو۔''

'' مگر فریم سے کوئی تصویر اپنے آپ کیسے نکل سکتی ہے؟''

''کیوں نہیں نکل سکتی؟''

''اس لئے کہ اپنے آپ کچھ نہیں ہوتا۔کچھ ہونے کے پیچھے بھی کچھ ہوتا ہے۔یہ اور بات ہے''یہ کچھ کبھی دکھائی نہیں دیتا۔''

''مگر تصویر فریم سے باہر کیوں ہوئی؟''

''ہاں اصل مسئلہ تو یہی ہے۔''

''تو اس فریم سے تصویر کے باہر ہونے کا سبب؟''

یہ تمام سوالات اپنے آپ میں اہم ہیں اور افسانہ میں حیرت واستعجاب جوراوی کی قسمیں ہیں مختلف صورتیں پیش کرتے ہیں۔

(۳) پھر یہ بھی کہ اگر سکون ہوتا تو انتشار،خلفشار اور آزار کا باعث کسے بناتے؟انسان کو چین سے رہنا کب آتا ہے۔.....''جس ہانڈی میں کھائے ،اُسی میں چھید کرے''والا معاملہ ہے۔

(۴) دائیں طرف کے فریم میں ایک گوشہ ہے جس میں بڑی تیج اور جوت والی تصویر ہے، جو دُخانی کھمبے سے قرمزی،روپہلے اور سنہری تاروں سے جکڑی ہوئی ہے۔کیوں؟ کیونکہ یہ بھی روشِ دوراں ہے۔رفتارِ زمانہ ہے۔قاری کو خود سوچنا ہے کہ یہ تار آخر اس قسم کے کیوں ہیں؟یعنی زندگی مصنوعی اشیاء سے مزین کرنا یا مادّی اشیاء سے اپنے آپ کو جکڑ لینا۔پھر فکری غبار میں ڈوب جانا گویا آسائشوں کا انبار اور قرض کا بوجھ۔سکون غائب نہیں ہوگا تو کیا ہوگا، بھلا بے جان اشیاء سے گھر کی رونقیں،سکون،راحت،صبر،قناعت انسان کو حاصل ہوتے ہیں؟قطعی نہیں......

نتیجہ ظاہر ہے، گجرا بھی ٹوٹے گا،مُرجھائے گا۔سر سے پاؤں کی طرف ہی آئے گا۔یعنی انسان کی عظمت اُس کے وجود کا تنزل،خوشبو، پھول، خوشی،مسرت،رنگ وآہنگ،ساز وآواز، جمالیاتی تسکین،سیرابی،سرشاری،شگفتگی،ترنم،سرور،امنگ،ترنگ،معصومیت، بھولپن،انسانیت......یعنی سبھی وہ جذبے جن سے زندگی گل گلزار بنتی ہے۔نفس کی پاکیزگی اپنا اثر دکھاتی ہے،شعور کو نمو بخشتی ہے،سُکھ کے ساگر کی ہلوروں کا باعث بنتی ہے، جسے افسانہ نگار نے''تزکیۂ نفس والاسُرور'' کہا ہے،کہاں سے حاصل ہوگا۔

بس یہی ان تین ٹاوروں اور تین فریموں کی کہانی ہے، روداد ہے۔ان میں قید انسان اور انسان کی فطرت سب جکڑے ہوئے ،قید،اس دنیا کی چار دیواری میں کچھ تو حرص وہوس کی خو،بُو لیے ہوئے ،کچھ مرنے مارنے کو تیار جیسی بے رحم اور سفاکانہ حرکتوں کے بھنور میں پھنسے ہوئے ،وہاں اُن کو یہ بھی احساس نہیں کہ وہ پھنسے ہوئے ہیں اور باقی بچے انسانوں کو کھدیڑنے ،نظروں سے گرانے ، ہیچ سمجھنے جیسی غیر انسانی حرکتوں کی وجہ سے اُن پر زبردست ذہنی دباؤ ڈالنے میں کوئی کور کسر نہیں چھوڑتے۔اسے کہتے ہیں بے حد منظم اور قوت سے احساس کمتری بھردینے کی بے نیازانہ یا غیر شعوری

سعی وعمل ۔مگر یہ عمل اس قدر خاموش اور غیر فطری ہوتا ہے کہ اِن ٹاوروں والوں کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگتا۔یہی حال اندھیرے ٹاور کے فریم والوں کا ہے۔ بس اندھیرے میں سر پیٹ پاٹ کرو ہیں تحلیل ہو جائیں گے۔مٹ جائیں گے،مرجائیں گے،نہ مریں تو،نہ مٹیں تو،سسک سسک کر سانسیں گنتے رہیں گے۔مگر فریم کی جکڑ بندی سے آزادی یا فرار ممکن نہیں ہوگی۔یہ دنیا،یہ زندگی،یہ روشِ دوراں،ہر حال میں ان کی حیات کا حصہ بنا رہے گا۔چاہے منہ چڑاتا ہوا ہی کیوں نہ ہو،چاہے ذلیل کرتا ہوا ہی کیوں نہ ہو،چاہے ان کی ہستی کو نیستی کا پیغام دیتا ہوا ہی کیوں نہ ہو۔مجبور کو تو مجبوری آنکھیں دکھاتی ہی ہے نا۔

تیسرے فریم کے متعلق افسانے میں کرداروں کے یہ مکالمے ملاحظہ ہوں۔

''کیا سوچنے لگے؟............ بتایا نہیں کیا سبب ہوسکتا ہے؟''

''شاید اس کا سبب دباؤ ہوسکتا ہے۔''

''کس کس دباؤ؟''

''اگل بغل والوں کا۔''

''مطلب ؟''

''پہلو میں کھڑے ٹاوروں کی تصویر کا دباؤ ۔''

''کس طرح کا دباؤ ؟''

''چمک چمک کا۔''

''دباؤ کی منطق ؟''

''ایک کا عروج،دوسرے کا زوال''

''یعنی ؟''

''توجہی اور بے توجہی کی نفسیات۔خود کو مرکزِ نگاہ میں رکھنے اور دوسرے کو دائرہ نظر سے دور اور بے بساط کر دینے کی نفسیات۔

''اچھا اور یہ ٹاور کیا ہیں؟''

''مجھے تو لگتا ہے یہ ٹاور ان تصویروں کی ماہیت کے مظہر ہیں۔''

''اور تصویریں؟''

''ترجمان ہیں۔''

''کس شے کی ترجمان؟''

''اس شے کی جو زمین کو آسمان بنا دیتی ہے۔''

غضنفر کا شعور بہت بالیدہ ہے۔تینوں ٹاوروں کا حال عجب تماشہ ہے اور یہ تماشہ کرتا ہے انسان۔دنیا کی چمک دمک،دولت،سیم وزر،ہیرے جواہرات کو حاصل کرنے میں چاہے انسانیت کو داؤ پر لگانا پڑے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ذلیل وخوار عادتوں،فریبوں،دھوکوں،جھوٹ سے طمع کے جنجال میں پھنسنا اور پھنس کر اُسے ہی زندگی کا حاصل سمجھ لینا بھی غمِ دوراں ہی نہیں بلکہ فرحت بخش احساس کے ساتھ اعلیٰ درجہ کا کمینہ پن ہوتے ہوئے بھی انسان

کے جسم میں اکثر گدازی پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔یعنی جو جتنا بڑا لٹیرا،اس کی طرف اسی قدر عزت آمیز طریقے اور للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے اور اُس جیسا عمل دہرانے کی دلی چاہت لیے ہر انسان کی آنکھیں اس طرف مرکوز نظر آتی ہیں۔افسانے میں صاف طور پر یہ دکھایا گیا ہے۔علامتی افسانہ رفتہ رفتہ کھلتا ہے، ذہن رکھتا ہے، فہم رکھتا ہے، غضنفر اس لئے کامیاب ہیں کہ سب کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے کی باتیں ہیں۔رَوِش یہی ہے، آج کے انسان کی......پھر یہ بھی بتاتے ہیں کہ اس پوری دنیا اور پوری انسانیت کو ہلاک کردینے والے ویپنس، اُن کا بازار، ملکوں کے درمیان فلاح و بہبود نہیں بلکہ اسلحہ کی خرید وفروخت کرنا اور پھر گوشت پوشت کے جیتے جاگتے، بندوں کو کٹے پھٹے لوتھڑوں میں تبدیل کردینے والی بہیمانہ حرکتیں، کہ جن پر کوئی روک ٹوک نہیں، کوئی قاعدے قانون نہیں، بلکہ جو قاعدے قانون اور پابندیوں کے احکامات صادر کرتے ہیں، ان کے خود کے پاس ان گنت بار اس سرزمین اور اس کے باشندوں کو پل میں لوتھڑوں میں تبدیل کرنے والے لاتعداد ہیبت ناک ہتھیار، بَم اور وہ بہت کچھ جو سینکڑوں مرتبہ اس دنیا کے چیتھڑے اڑادینے کے ذریعوں کا مادہ رکھتے ہیں، ایک خزانے کے طور پر محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔

انجام کار ہر ملک، دوسرے ملک سے ڈرا ہوا، سہما ہوا۔ بڑی فوج، زیادہ ہتھیار اور سیاست کے نام پر امن وامان، خوشی ومہک کو زندگی سے پرے کردینے والے فیصلے لیتے چلے جانا ''روشِ دوراں'' نہیں تو اور کیا ہے۔غضنفر نے ایک ایسی مصوری کے نمونے کو خلق کرکے کہانی میں آج کے منظرنامے کو پیش کیا ہے بلکہ جب سرحدیں تعمیر کی گئیں اور جب سے قوموں اور ان کے عروج کا خیال پنپا تھا۔تب سے لے کر دورِ حاضر تک کی کہانی ہے۔ ''خالی فریم۔''

اس افسانے کے بے حد سفاکانہ حقائق سے افسانہ تو زندہ ہو گیا، مگر انسان مارا گیا۔دیکھئے افسانہ کا ایک اقتباس:

> ''ٹاوروں کے آگے پیچھے دائیں بائیں کی سرسبز زمین پر جگہ جگہ لمبی چوڑی خاکستر پٹیاں، ادھر اُدھر بکھری ہوئی لوتھڑے۔جھیلوں اور تالابوں کے شفاف پانی سے نکلتے ہوئے شعلے، نیلگوں فضا میں اُڑتے ہوئے آتشیں گولے اور سیاہ مرغولے۔ایک گوشے میں دُخانی کھمبے پر سنہرے روپہلے اور قرمزی تاروں سے بندھی ہوئی ایک تصویر جس کے ماتھے پر تیج اور آنکھوں میں جوت۔تصویر کے پیروں کے نیچے ٹوٹا ہوا ایک ساز اور مرجھایا ہوا ایک گجرا۔''

اس اقتباس کے ساتھ غضنفر کا یہ مکالمہ کہ ''آرٹ یوں نہیں کھلتا'' خود اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ شبہات، قیاسیات اور انسانی آفات کے دائروں میں جکڑا ہوا انسان اور اُس کے تباہ کُن ایجادات کی وجہ سے خود خلق کرنے والے کا وجود خطرہ میں ہے، جب کوئی نہیں بچے گا تو وہ کون سی خوش فہمی ہے جو انہیں لوتھڑا بننے سے بچالے گی؟......نہیں کوئی نہیں بچا سکتی۔......قطعی نہیں......مگر پھر بھی حالت تو یہ ہے کہ اُس نے اتنے تو نہیں میں اتنے بناؤں......وہ یہ بنائے، تو میں یہ بناؤں، وہ یہ خریدے تو میں یہ خریدوں......چاہے عوام بھوکی ننگی رہے، چاہے تعلیمی اداروں کا فقدان ہو، علمی معیاروں سے عاری ہوں......چاہے ہاسپٹل نہ ہوں، ان میں اعلیٰ درجے کے آلات اور مثبت انتظامات کا فقدان ہو......چاہے سسٹم سڑا گلا جا رہا ہو......لیکن عوام کے ٹیکس کا ایک بڑا حصہ وہ بارودی ہتھیاروں کی خرید وفروخت میں لگائیں گے......دانشوروں کی کون سنتا ہے۔عقلمند اگر امن پسندی کی بات کرے تو اُس کا مذاق اڑایا جاتا ہے......شاعر وادیب، ناول افسانہ ڈرامہ نگار تو صرف تفریح وطبع کے معاملات تک ہی برداشت ہوتے ہیں نا۔

یہ سب تو سوائے فنونِ لطیفہ کی نمائشوں کو دیکھنے، سمجھنے اور پھر آپس میں سر سے سر جوڑ کر کچھ کہہ سن لینے تک کے ہی رہ گئے ہیں......فنونِ لطیفہ کی

گہرائیوں میں کون اُترنا چاہتا ہے......؟......دائیں بائیں ٹاور والے تو ہرگز نہیں......بالکل نہیں......بلکہ وہ تو فنکاروں کو بھی اندھیرے ٹاور کے خالی فریم میں دھکیل چکے ہیں......کیونکہ غربت مال وزر کی کمی سے ہی نہیں، ناقدری، تذلیل آمیز حرکات وسکنات سے بھی مترشح ہوتی ہے۔خود غضنفر نے اس کی وضاحت اس طرح کی ہے:

''شور وشر کو روکنے والا خود رک گیا ہے۔شاید اُسے شکنجوں میں کس دیا گیا ہے اور جس کا تار اس فریم سے جڑتا ہے وہ بھرے ہوئے فریموں کے درمیان خالی پڑا ہے۔''

آج مصور ہو یا ادیب یا سنجیدہ فن سے وابستہ کوئی بھی شخصیت، عالم ودانا......لاکھ نمائش لگا لیجئے، کانفرنسیں کر لیجئے، سیمینار کر لیجئے، ادبی میلے یا لٹ فیسٹ کروا لیجئے، ان میں بے باکانہ انداز بھی اپنا لیجئے، بے خوفی سے اشتعال انگیز تقریریں بھی کر لیجئے......دائیں بائیں ٹاور کی تصاویر کا پکا فریم بات اندر تک پہنچنے ہی نہیں دے گا۔......پہنچ جائے گی تو پرواہ ہی نہیں کرے گا، بھاؤ نہ دے گا......زیادہ سے زیادہ کوئی سرپھرا آپ پر FIR درج کروا کر عدالت میں گھسیٹ لے جائے گا......عدلیہ مٹھی میں، پولس مٹھی میں، میڈیا مٹھی میں، پالیامنٹ مٹھی میں، منتخب صوبائی حکومت پر قبضہ جمانا مٹھی میں...... درمیان کے ٹاور کے ''خالی فریم'' سے تصویر ہٹانا، لگانا، پھینکنا، اگر لگانا بھی تو بدرنگ کر دینا، جس کا ہونا پھر نہ ہونے کے برابر ہی ہو......وغیرہ جیسے کرم کانڈ کروا کر آپ کو مکمل طور پر زیر کرنے کا مکمل لیکھا جوکھا تیار کر کے رکھنا، ان کی چٹکیوں کا کھیل ہے۔پھر بے چارے محنت کش طبقے، کسان، دَلت، آدی باسی، کس کھیت کی مولی ہیں......؟......ان کا زوال تو دائیں بائیں ٹاور کے عروج پر ہی تو منحصر ہے......اُن سے لوٹو اور اپنا پیٹ بھرو......سرمایہ داری کے نئے نئے فیشن ایبل طور طریقے چل نکلے ہیں۔

غضنفر نے ''خالی فریم'' افسانے میں علامتی بیانیہ اور تجریدی اندازِ تحریر کو اپناتے ہوئے ماضی اور حال کے حالات، احساسات، تصادمات، تعصّبات، منافقت، عداوت کے عناصر کی ترجمانی پیش کی ہے۔جن سے بنی نوع کسی صورت باز نہیں آتے......حق سے دوری اور باطن کی راہوں میں سرگشتگی عارضی ووقتی فائدے تو بہم پہنچا سکتی ہے لیکن پائیداری اور دائمی فوائد سے محروم کر دیتی ہے۔سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ......یعنی رہی یہ دنیا تو یہ محض ایک ظاہر فریب کی چیز ہے۔''

اور تینوں ٹاوروں پر نسب فریم اور تصاویر کا یہی مقصد ہے کہ انسانی زندگی کے لئے قانون، اخلاق کی شاہراہ بنانا، طرزِ عمل کی اصلاح کرتے ہوئے زمانۂ سابق سے نصیحت لینا، مساویانہ برتاؤ کرتے ہوئے فکر وتہذیب وتمدن کو صدق دل سے تختۂ مشق بنانا آج کی اہم ضرورت ہے۔یہی اس افسانے کی مرکزی فکر ہے۔اور مزید یہ کہ خالی فریم اور اندھیرے میں بہت سے امکانات پوشیدہ ہوتے ہیں۔اندھیرے سے ہی روشنی کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔خالی جگہ کو پُر کرنے کے لئے وہ روشنی وہ چمک اسی تختۂ مشق کی روزی ہے، تسلسل ہے، حسنِ عالم کی بشارت ہے۔انقلابی صفات اور فکرِ نو کی آمد کا استعارہ ہے۔مرغوباتِ نَفَس کے قریب سے دور کارنامۂ حیات کا فیضان ہے۔حقیقی نیک نیتی اور مساویانہ روشن کی شاہراہ ہے۔باہمی حقوق، اخلاقِ فاضلہ کا دہانۂ فوارہ ہے۔'خالی فریم'' کے بطن میں پوشیدہ فکر وفن کے یہی وہ رموز ہیں جن سے غضنفر قاری کو آشکار کرنا چاہتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

رسالہ جنگ یورپ

ڈاکٹر ارشد سراج

صدر شعبہ اردو گورنمنٹ ایس کے کالج سیکر

رسالہ جنگ یورپ راج پوتانے کی ریاست جھالاواڑ سے جاری ہوا کرتا تھا۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کے دوران والیٔ ریاست جھالاواڑ راج رانا بھوانی سنگھ کے ایماء پر ریاست کے تمام افسران نے جنگ کے متعلق موضوعات پر لیکچر دیئے تھے ان تمام لیکچروں کو رسالۂ جنگ یورپ کی شکل میں ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۹ء تک جیل پریس جھالاواڑ سے جاری کیا گیا بقول مفتوں کوٹوی اس کا سائز ۲۶x۲۰/۸ تھا کاغذ سفید کتابت اور طباعت خوش نما ہوتی تھی۔ لالہ شمبھو دیال دانش اور بابو اٹل بہاری لال کو اس کا مدیر مقرر کیا گیا تھا بقول مولوی عبدالحق

'لیکچروں کا سلسلہ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۹ء تک جاری رہا یہ سلسلہ سابق مہاراج کے حکم سے شروع ہوا تھا اور ہر افسر موضوعات جنگ میں کسی ایک موضوع کو اختیار کر کے اس پر تیار ہو کر لیکچر کیا کرتا تھا۔ یہ تمام لیکچر سرکاری مطبع میں چھپ چکے ہیں ان کی زبان اردو ہے اور رسم الخط بھی اردو ہے' (۱)

یہاں بقول مفتوں کوٹوی یہ بات بھی واضح رہے کہ والیٔ ریاست راج رانا بھوانی سنگھ نے ہندی داں طبقہ کو بھی اس سے استفادہ کے مواقع بہم پہونچائے اور اس رسالے کو ہندی زبان میں بھی جاری کرنے کا حکم نافذ کیا اس طرح رسالۂ ہٰذا سے اہل ہندی وار دو دونوں حضرات مستفیض ہوئے اور جنگ عظیم کے ہولناک واقعات سے واقفیر حاصل ہوئی۔ ہندی رسم الخط میں جاری ہونے والے رسالۂ ہٰذا کے لئے پنڈت گروہر لال شرما کو مدیر مقرر کیا گیا۔ رسالہ جنگ یورپ میں جنگ عظیم کے اسباب وعوامل بحری وبری افواج کے کارنامے، آلات جنگ ڈاک اور کھانے پینے کے اسباب لے جانے کے ذرائع، آب دوز کشتیاں طیارے اور مخبروں کی کارگزاریاں وغیرہ موضوعات پر ریاست کے بڑے بڑے لائق وفائق اشخاص اور خود والیٔ ریاست بھوانی سنگھ کے لیکچرس شامل اشاعت ہوکرتے تھے۔ بیسویں لکچر کے ٹائٹل کے اخیر جانب مندرج ایک اعلان کا اقتباس یہاں پیش ہے جس سے رسالۂ ہٰذا کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے گا

'ان رسالوں میں ریاست کے بڑے بڑے لائق صاحبوں کے مضامین درج کئے جاتے ہیں ان مضامین سے ناظرین کو علاوہ وجوہات جنگ، لڑنے والی بادشاہوں کی طاقتوں کے حالات، جاسوسوں کے کارنامے، میدان جنگ میں ڈاک رسانی و خوردونوش وغیرہ سب میرین (SUBMARINE) ہوائی جہاز ان حالات حرب کے مفصل حالات جو اس جنگ میں کام دے رہے ہیں لڑنے والی بعض سلطنتوں کی تواریخ اور ہندوستانی سپاہ کے کارنامے غرض ہر طرح کے حالات معلوم ہوا کریں گے'

ان لکچرس میں سے بعض یہ ہیں جن کا تذکرہ مولوی عبدالحق نے کیا ہے

لکچر نمبر ا 'برطانیہ کی بحری طاقت' از ماسٹر شیام بہاری لال سول جج جھالاواڑ

لکچر نمبر ۳ 'بلجیم پر جرمن مظالم' از راج رانا بھوانی سنگھ

لکچر نمبر ۷ 'جرمن جاسوسی' از پنڈت شیو کمار چتر ویدی

لکچر نمبر ۲ 'جنگ یورپ' از سید مصطفیٰ حسین رضوی

لکچر نمبر ۱۲ 'جنگ میں شفاخانہ کا انتظام' از بابو مٹھن لال

لکچر نمبر ۱۶ 'درہ دانیال' از بھائیا شادی لال

لکچر نمبر ۱۸ 'ملک کی ہمدردی' از پنڈت دھنی رام

علاوہ ازیں مفتوں کوٹوی دیگر لکچر کے نام یہ ہیں

(۱) 'جنگ یورپ کے اسباب اور ہمارے فرائض' از راج رانا بھوانی سنگھ

(۲) 'دولت برطانیہ کی خوبیاں' از ایڈیٹر

(۳) 'جنگ یورپ کے مفصل حالات' از پنڈت دھنی رام

(۵) 'اہل ہند کے فرائض' از سید مصطفیٰ حسین رضوی

(۶) 'جرمنی کے مختصر حالات' از بابو جگ موہن لال

(۷) 'میدان جنگ میں انتظام ڈاک' از پنڈت دھنی رام

یہ تمام لیکچرس ابتداء میں ہفتہ وار ہوا کرتے تھے بعد میں ماہانہ جاری کئے گئے ان میں ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ہر لیکچر کے ساتھ ایک نظم بھی ہوتی تھی۔ ان تمام لکچرس کا سلسلہ ایام جنگ تک ہی قائم رہا اور چار سال تک مسلسل رسالہ جنگ یورپ کی شکل میں جاری کئے گئے۔ جنگ کے اختتام پر ان کا سلسلہ موقوف ہوگیا۔ یہاں پر جن لکچروں کی تفصیل فراہم ہوسکی صرف ان کا ہی ذکر کیا گیا ہے

حاشیہ:۔

(۱) جائزہ زبان اردو ص ۱۰۱ مرتبہ مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو ہند دہلی

☆☆☆☆☆

راجستھان کی ہم عصر اردو غزل...............................ایک مطالعہ

ڈاکٹر اسماء مسعود
اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو
گورنمنٹ ڈونگر کالج بیکانیر

۲۱ویں صدی تبدیلیوں کی صدی ہے۔سماج،سیاست اور زندگی کی ہر شے تبدیلیوں کی زد پر ہے۔ادب زندگی کا آئینہ ہے۔اس لئے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ادب میں بھی تبدیلیاں آتی ہیں۔خاص طور پر دو عالمی جنگوں کی تباہ کاریوں نے شعر و ادب پر بہت گہرے اثرات ڈالے۔مایوسی ،افسردگی اور خوابوں کی شکست و ریخت نے اجتماعیت سے رشتہ توڑ کر فرد کو خود میں سمیٹ کر رکھنے پر مجبور کر دیا،نتیجہ میں شعر و ادب میں بھی انفرادیت اور داخلیت کا رجحان پروان چڑھا۔

غزل اپنی سرشت کے اعتبار سے رومانی اور داخلی جذبات کی ترجمان ہے۔لیکن اس کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس نے ہر بدلتے ہوئے زمانے کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔یہاں بڑے سے بڑا موضوع دو مصرعوں میں سما جاتا ہے غزل ایک ایسی ہمہ گیر اور دلآویز صنفِ سخن ہے جس کی جڑیں ہمارے معاشرے اور تہذیب میں بہت گہرائی تک پیوست ہیں۔

۲۱ویں صدی کی غزل کی بنیاد عصری زندگی کے حالات اور واقعات کی سیدھی عکاسی پر ہے آج کا غزل گو شاعر اپنے عہد کے حالات و حادثات کو اپنے داخلی رنگ میں رنگ کر اس طرح پیش کرتا ہے کہ پڑھنے والے کی آنکھ خود پر گزری ہوئی کسی کیفیت کو یاد کر کے نم ہو جاتی ہے۔آج کی غزل آج کی بدلتی زندگی کی ترجمان ہونے کے باوجود غزل کے بنیادی مزاج کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔شہریار نے لکھا ہے۔

جب بھی ملتی ہے مجھے اجنبی لگتی کیوں ہے
زندگی روز نئے رنگ بدلتی کیوں ہے

لیکن آج کی غزل نے نئے افکار و خیالات کو نئے لہجے میں بھی بخوبی پیش کیا ہے۔ندا فاضلی کا شعر ہے

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

آیئے آج کی راجستھان کی اردو غزل پر گفتگو کرتے ہیں۔راجستھان میں اردو غزل کی ایک طویل روایت رہی ہے اور یہاں ایسے بہت سے شاعر موجود ہیں جنہوں نے ملکی سطح پر راجستھان کا نام روشن کیا ہے۔راجستھان کی جدید اردو شاعری میں اپنے قلم کی طاقت دکھانے والوں میں مخمور سعیدی،عشرت دھولپوری،فضل المتین،ممتاز راشد،عقیل شاداب،شاہد عزیز،احتشام اختر،ابنِ رضا،مضطر صدیقی،عابد ادیب ظفر غوری،ممتاز شکیب اور ڈاکٹر سخاوت شمیم وغیرہ اردو دنیا میں اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔

راجستھان کی آج کی اردو غزل موجودہ عہد کی کڑوی سچائیوں سے آنکھیں ملاتی ہے،آج Globalisation اور بازار کے کھلے پن نے جہاں دنیا کو

چھوٹا کر دیا ہے وہیں سیاست کے بدنما چہرے نے ظلم کی نئی عبارت لکھنی شروع کر دی ہے تمام دنیا کے ساتھ ہندوستان میں بھی اس کی کہانیاں بکھری ہوئی ہیں خود غرضی نفرت اور کدورت سے بھر پور سیاست نے عوام کے جمہوری حقوق پر گہری چوٹ کی ہے۔ ثقافتی اور سماجی بحران نے انسان انسان کے درمیان نفرت بڑھانے کے ساتھ غریب عوام کے دکھوں میں اور اضافہ کیا ہے۔ ایک طرف غریب بنیادی ضرورتوں سے بھی محروم ہے تو دوسری جانب کروڑ پتیوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے انسانیت زخموں سے چور ہے اور غریب کو ایک ایک نوالے کے لئے جدوجہد کرنی پڑتی ہے موجودہ عہد کے راجستھان کے غزل گو شعراء کا کلام کس حد تک آج کے Challenges کا مقابلہ کرتا ہے۔ یہ دیکھنا ہے۔

دورِ حاضر کے راجستھان کے اردو شاعروں میں ش،ک، نظام، نذیر فتحپوری، شاہد میر، انعام شرر، سعید روشن، ارشد عبدالحمید، لطیف فہمی، حبیب کیفی، فاروق انجینئر، فاروق بخشی، ذاکر ادیب، ملکہ نسیم، احتشام اختر، ابرار فائق، ڈاکٹر محمد حسین، عادل رضا، شکور انور، شاہد پٹھان، خلیل تنویر وغیرہ کی ایک طویل فہرست ہے۔ جنہوں نے اپنی غزل کو اپنے دور کی آواز بنا دیا۔ درجِ ذیل اشعار سے راجستھان کے موجودہ غزل گو شعراء کے فکری اور شعری رویئے اور پیرایۂ اظہار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں

ابھی محاصرہ ٹوٹا نہیں اندھیروں کا
میری زمیں پہ ابھی آفتاب رہنے دے — نذیر فتحپوری

شکستہ خال و خط ہیں منتظر تیری نگاہوں کے
میں ایک بھولی ہوئی تہذیب ہوں معلو م کر مجھ کو — شاہد میر

مقابلہ تھا بہت سخت پر کیا ہم نے
جلا کے زد پہ ہوا کے دیا رکھا ہم نے — احتشام اختر

اداس لمحوں کے موسم ہیں خیمہ زن دل میں
سلگتی دھوپ سروں پر ہے سائبان تو دے — فاروق بخشی

میں حادثوں سے پوچھ رہا ہوں بصد خلوص
کافی دنوں کے بعد ملے ہو کہاں رہے — اظہار مسرت

کون جانے کہاں دفینے ہیں
اپنے تو پاس صرف نقشے ہیں — ش،ک، نظام

صورتیں چھین لے گیا کوئی
اس دفعہ آئینے اکیلے ہیں

پتھروں کے درمیاں کیا کیا فسانے رکھ دئے
قید کر کے ہم نے لمحوں میں زمانے رکھ دئے — ملکہ نسیم

خوشا نصیب ابھی اعتماد کی قندیل
تمہارے اورمیرے درمیان روشن ہے ذاکرادیب

تہذیب جل رہی ہے عداوت کی آگ میں
انسان بس رہا ہے خداؤں کے درمیاں ڈاکٹرمحمدحسین

میری اڑان میرا حوصلہ نہیں دیکھا
وہ سوچتاتھا میرے پر کتر کے آیاہے ابرارفائق

راجستھان کی معاصرغزل کے شاعرنے اپنے داخلی احساسات اورخارجی تجربات کےاظہار کے لئے غزل کے رموز وعلائم اورلفظیات کواپنی تخلیقی ہنرمندی کے ساتھ اس طرح پیش کیا کہ اس کی پرانی باتیں بھی نئی معلوم ہوتی ہیں۔ وہ آج کے معاشرےاورآج کےانسان کے مسائل کواپنی ذات کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہےاوراس کی سیدھی عکاسی پر زور دیتا ہے۔ وہ غزل کے روایتی لفظیات سے استفادہ بھی کرتا ہےاورنئی زندگی کی الجھنوں اور مسائل کی ترجمانی کے لئے نئے الفاظ اورنئی علامتوں کے ساتھ قدیم لفظیات کو نئے معنی میں استعمال کر کے غزل کے دامن کووسیع بھی کرتا ہے۔

آج کی غزل کی شناخت عرضیت اورواقعیت پر ہے۔ جوموجودہ معاشرتی، سیاسی، اورتہذیبی عوامل کی دین ہے۔ بیکانیر کےموجودہ عہد کے شاعر ذاکرادیب کے چنداشعاردیکھئے:

بستی میں تجھے کون سا ڈرکاٹ رہا ہے
کیا بات ہے کیوں بوڑھے شجرکاٹ رہا ہے
آزادیٔ اظہار سے کیا خوف ہے اس کو
کیوں طائرِ تخیل کے پر کاٹ رہاہے
پرانی حویلی کے قصے سناکر
وہ بستی کے لوگوں میں ڈر چھوڑ تاہے
جو دسترس میں ہوں سارے غریب بچوں کی
کھلونے ایسے ہی اپنی دکان میں رکھنا
تیرے چہرے پہ گرد ہے غم کی
اے زمانے تجھے ہوا کیا ہے
فراتِ وقت پہ پہرہ لگاہے
ہرایک لمحہ ابھی کرب و بلا ہے

ہیں مخالف ہوائیں پھربھی ہنوز
پنچھیوں کی اڑان جاری ہے

موجودہ سیاسی منظرنامے اوراس کی مکروہات نے خوف،دہشت اور بے امانی کا جو ماحول پیدا کیا ہے اس سے آج کا غزل گوشاعربھی متاثر ہے اس لئے اس کی غزل میں نرم خوبصورت اور داخلی احساسات وجذبات کی ترجمانی کم دکھائی دیتی ہے۔اس کاقلم اپنے عہد کے آشوب کوزیادہ نمایاں کرتا ہے۔فاروق بخشی لکھتے ہیں۔

شہر کے شہر جلے پھربھی رہا وہ خاموش
اب بھی کہتے ہو خدا سب کا نگہبان ہے کیا

ایک پُرآشوب دور میں زندگی گذارنے والے شاعر کےعشق میں رومانیت کے بجائے ہجراورتنہائی کے موضوعات ہیں۔جن پردکھ کے گہرے سائے پڑے ہیں۔فاروق بخشی کے ہی کچھ اوراشعار دیکھئے:

میں کہیں جاؤں مری جلتی ہوئی آنکھوں میں
ہرگھڑی تجھ سے بچھڑ جانے کا منظر ابھرے
دنیا یہ کہہ رہی تھی تجھے بھول جاؤں گا
اپنے خلاف مجھ سے یہ سازش نہ ہوسکی

عصری زندگی کی سفاکیوں،سیاست کے مکروہات اور جبروتشدد کے اظہار کے لئے ہمارے نئے شعراء نے کربلا کے استعارے سے کافی کام لیا ہے۔سانحۂ کربلا اور متعلقاتِ کربلا کو راجستھان کے موجودہ شاعروں نے بھی ہم عصر زندگی کے سنگین حقائق سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔کوٹہ کے شاعر شاہدؔ پٹھان کے کچھ اشعار دیکھئے:

صدا یہ آتی ہے کرب و بلا کی جانب سے
کسی یزید کی بیعت پہ سرنہ خم کرنا
ہرایک دور میں ہوتے رہے یزیدوکنس
کبھی نہ ختم جہاں میں ستم کا باب ہوا
کربلائے زندگی میں سرخرو ٹھہرے ہمیں
کٹ کے بھی نیزے پہ شاہد اپنا سر اونچا رہا
چشمِ افلاک بھی خون روتی رہی
کربلا تھی زمیں چارسودور تک

عرضیت اور واقعیت کے باوجود موجودہ غزل گوشعراء کے یہاں غزل کاتخلیقی حسن برقرار ہے۔عام طور پر وقتی اور ہنگامی موضوعات شعر کے

تخلیقی حسن کو مجروح کر دیتے ہیں۔اوراس میں کرختگی پیدا ہو جاتی ہے۔لیکن راجستھان کے موجودہ غزل گوشعراء کی ایک اچھی تعداد ایسی ہے جنہوں نے خارجی موضوعات میں بھی تغزل کو برقرار رکھا ہے۔مثلاً ۔

وہ سر بلند ہوا ہے یہاں سرِ نیزہ
بغیر خوف جو باطل کے درمیاں بولا ذاکرادیب

یہ زندگی ہے کہ بے نام خواہشوں کا سفر
حیات دشت ہے صحرا ہے میں اکیلا ہوں ابرارفائق

مٹی مٹی ہوئی تحریر زندگی جو پڑھی
نہ جانے ان کہی کتنی کہانیاں نکلیں

ترازو منصفوں کی قید میں ہیں
جہاں گیری کہاں کی ؟کون اکبر ملکہ نسیم

اے وقت اب تو کانٹے کا ہوگا مقابلہ
میں خیر لا رہا ہوں تیرے شر کے سامنے نذیرفتحپوری

دن تو کٹ جاتا ہے ہنگامۂ ہستی میں مگر
خوں رلاتی ہے تیری یاد مجھے شام کے بعد شاہد پٹھان

قتل کے بعد بھی زندہ ہوں علامت یہ ہے
سر ہے مصروف تلاوت سرِ نیزہ میرا حیدرؔی

آج کے دور میں جمہوری قدروں کا زوال،انسان کے دل میں اپنی حفاظت کے اندیشے،خوف،رشتوں کا بکھراؤ،صنعتی ترقی کے نتیجہ میں انسان کی بدلتی ہوئی فطرت۔سیاسی المیہ اور جبر وتشدد ان تمام مسائل وموضوعات میں آفاقیت اور گہرائی ہے۔یہ مسائل صرف راجستھان کے شاعروں کو ہی درپیش نہیں ہیں بلکہ آج دنیا کا ہر علاقہ بے حسی بے تحفظی اور دہشت کی زد پر ہے۔اورعہدِ حاضر کا المیہ یہ ہے کہ ہر شخص امن وامان کی تلاش میں بھٹک رہا ہے لیکن امان کہیں نہیں۔

دورِحاضر کے راجستھان کی شاعری کی قد آور شخصیت مخمورؔ سعیدی نے روایتی رومانی شاعری سے ابتدا کر کے اپنی غزل کو فکر وفن کی اعلیٰ منزلوں تک پہنچا دیا،عصری زندگی کی حسیت کے باوجود ان کی غزل،غزل کے مخصوص مزاج کو برقرار رکھتی ہے۔

مسافر اپنے ہی سائے میں تھک کے بیٹھ گئے
کہ دھوپ حدِنظر تک دکھائی دیتی تھی

جدیدیت سے متاثر عقیل شاداب موجودہ زندگی کی صداقتوں کے اظہار میں ہندوستانی اساطیر سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔

دونوں حالات کے مارے ہیں اسے کیا کہئے
آپ دمینتی کی مانند ہیں میں نل کی طرح

خلیل تنویر نے اگرچہ غزل کم کہی ہے نظم زیادہ لکھی لیکن ان کی غزلیں فنی ہنرمندی کے ساتھ اپنے عہد کے مسائل کو اشارتی اور ایمائی اسلوب میں خوبی سے پیش کرتی ہیں۔

پرندہ شاخ پہ تنہا اداس بیٹھا ہے
اڑان بھول گیا مدّتوں کی بند ش میں

شاہد عزیز نے بھی غزلیں کم لکھی ہیں لیکن جدید لفظیات کے باوجود ان کی غزلیں پیچیدگی سے پاک ہیں۔

ہمیں راستے میں سمندر ملے
مگر سب زمینوں کے اندر ملے

احتشام اختر کہتے ہیں کہ میں نے اپنی شاعری کو پروپیگنڈے اور جدیدیت کے پیچیدہ اظہار سے دور رکھ کر عصری مسائل و معاملات کو احساس اور جذبے کے خلوص کے ساتھ سادہ انداز میں پیش کر دیا۔ اسکا اظہار ہمیں ان کی غزلوں میں نظر آ جاتا ہے۔

اس ایک شخص کا میں منتظر ہوں برسوں سے
جو کہہ گیا تھا میرا انتظار مت کرنا
کربلا ہم نے بھی دیکھی ہے میاں
زندگی کاٹی ہے پیاسوں کی طرح

خوشتر مکرانوی جدیدیت سے متاثر شاعر ہیں جنکے یہاں عصری آشوب جدید لفظیات میں نمایاں ہوتا ہے۔

قتل ہوتا ہے دھوپ میں جنگل
چاٹتی ہے زمین سایوں کو
تک رہی ہیں غلیل کی آنکھیں
اُڑ رہے ہیں کپاس کے پنچھی
فاختائیں پہلے ہی مشکوک تھیں
اور آ کر کے کبوتر مل گئے

ہم دیکھتے ہیں کہ آج کے راجستھان کے غزل گوشعرا نے روایتی الفاظ کو نئے نئے تناظر میں استعارے اور علامتوں کے طور پر استعمال کیا ہے۔ مثلاً رات، شہر، پیاس، خواب، گرد، غبار، دشت، ہوا، ہنر، جنگل، صحرا، دریا، سمندر، پانی وغیرہ الفاظ آج کے راجستھان کی اردو غزل کا حصہ ہیں

جنہیں اس خطے کے۔ شاعروں نے اپنے مشاہدات اور تجربات کے اظہار کے لئے نئے تناظر میں نئے معنی میں پیش کیا۔

یہ زندگی ہے کہ بے نام خواہشوں کا سفر
حیات دشت ہے صحرا ہے میں اکیلا ہوں ابرار فائق

بستیاں خاک ہوئیں ٹوٹ گئے سب رشتے
خاموشی تو ہی بتادے یہ خطا کس کی ہے فاروق بخشی

اے وقت اب تو کانٹے کا ہوگا مقابلہ
میں خیر لا رہا ہوں ترے شر کے سامنے نذیر فتحپوری

فضائے امن میں فتنے جگا رہا ہے کوئی
ہر ایک شہر کو مقتل بنا رہا ہے کوئی شاہد پٹھان

فسانہ بن گئیں باتیں وہ حق بیانی کی
فرازِ دار پہ اب کوئی سر نہ آئے گا **ذاکر ادیب**

مجموعی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ راجستھان میں آج کے غزل گو شعراء غزل کی کلاسیکی روایت کا شعور رکھتے ہیں۔ عصری حسیت کے اظہار کے لئے وہ الفاظ کے ایسے پیرائے تلاشتے ہیں جو روایتی نہیں رہتے۔ ہمارے ان شعراء نے نئے الفاظ کے استعمال کے ساتھ روایتی الفاظ کو بھی نئے تناظر میں استعمال کر کے غزل کے دامن کو فکری وسعت سے ہم کنار کیا اور غزل میں ایک تازگی اور نئے پن کا احساس کرا دیا ہے۔ راجستھان کی آج کی غزل کی خوبی یہ ہے کہ لفظیات کی سطح پر ہماری غزل کو نئی تبدیلیوں سے ہمکنار کرتے ہوئے ہمارے غزل گو شعراء نے غزل کے فنی تقاضوں کو خوبصورتی سے نبھایا یہ اس کی سب سے بڑی قوت ہے۔

☆☆☆☆☆

محمد خالد عابدی: ایک ہمہ جہت اور عہد آفریں شخصیت

ڈاکٹر معین الدین شاہین

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو

سمراٹ پرتھوی راج چوہان گورنمنٹ کالج، اجمیر

زیرِ نظر مضمون کا عنوان بہت غور وفکر کے بعد قائم کیا گیا ہے۔ چونکہ عابدی صاحب نے ازاول تا ایں دم مختلف حوالوں سے یا مختلف تناظر میں اردو زبان وادب کی خدمات انجام دیں اس لئے انہیں بجا طور پر ہمہ جہت اور عہد آفریں شخصیت ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ شاید ہی ایسا کوئی شخص ہو جسے اس سے انکار ہو کہ عابدی صاحب کی شخصیت ہمہ جہت اور عہد آفریں نہیں ہے۔ اگر بالفرض ایسا کوئی شخص نکل آیا تو راقم الحروف کی نظر میں وہ کور چشم اور سنگ دل ہی ہوگا۔

عابدی صاحب کی ادبی زندگی کا سفر شعر گوئی سے شروع ہوا۔ جب آپ خالدؔ بھوپالی کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے تھے تاہم ایک مقام پر خود فرماتے ہیں کہ :

''ادب میں میری ابتداء شاعری سے ہوئی تھی۔ میں شاہدؔ بھوپالی اور بعدہٗ عشرت قادری صاحب سے اصلاح لیتا تھا۔ خالدؔ بھوپالی تخلص کرتا تھا۔ میں اپنے اساتذہ سے معمولی باتیں بار بار پوچھتا رہتا تھا۔ کئی معاملے میں ہمارے ایک استاد نے کہا کہ تم بہت پوچھتے ہو اور وہ پوچھتے ہو جو ہم نے پڑھا نہیں یا ہم اس علم وفن کے بارے میں جانتے نہیں ہیں۔ میں موزوں طبع تھا، میرا وہ کلام جو 'ملاپ' پرتاپ دہلی میں چھپتا تھا اسے میں نے بھی محفوظ نہیں رکھا۔ فن عروض سے مجھے دلچسپی تھی۔ اس فن کو نہ جاننے کا صدمہ آج بھی ہے۔''

اگر عابدی صاحب نے اپنے مطبوعہ کلام کو یکجا و محفوظ رکھا ہوتا تو ممکن ہے ایک مجموعہ یا انتخاب شائع ہو سکتا تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہیں شاعری کے مقابلے نثر سے زیادہ لگاؤ رہا۔ لیکن اُن کی شاعرانہ حیثیت مسلّم ہے۔

شاعری کے مقابلے نثر میں عابدی صاحب نے زیادہ کام کیا ہے۔ عام روش سے گریز کرتے ہوئے انہوں نے نثر میں اچھوتے موضوعات پر قلم اٹھایا۔ اسی لئے عہدِ حاضر کے سخت گیر اور اعتدال پسند، دونوں قسم کے نقادوں نے اُن کے کارناموں کو بجا طور پر داد وتحسین سے نوازا ہے۔ عابدی صاحب کے نثری کارناموں کے پیشِ نظر انہیں اردو ادب کا کولمبس قرار دیا جائے تو شاید بیجا نہ ہوگا۔ وہ اس ذیل میں بقول اقبالؔ یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ :

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم ن ے

بہ حیثیت افسانہ نگار عابدی صاحب کا مقام نہایت وقیع ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کو انفرادیت سے مالا مال کرنے کی سعی کی ہے او رانہیں موضوعات پر افسانے تحریر کئے ہیں جو ان کے تصورات وتفکرات کے عین مطابق ہیں۔ ان افسانوں پر حقیقت پسندانہ تخیلات کا عکس دکھائی دیتا ہے اس ضمن میں اُن کے افسانوی مجموعے ''زخموں کے دریچے'' (مطبوعہ ۱۹۸۸ء) کا مطالعہ ناگزیر رہے۔ اس مجموعے کے مشمولات نہ تو غیر ضروری ہیں اور

نہ ہی غیر معتدل۔ اس کے علاوہ افسانچہ نگاری کا رجحان عام ہونے پر انہوں نے افسانچہ نویسی کے میدان میں بھی اپنا لوہا منوا کر دم لیا۔ ان افسانوں میں صنفِ غزل جیسا ایجاز و اختصار، اثر پذیری اور وسعت موجود ہے کیونکہ عابدی صاحب نے غزل کے شاعر کی طرح ان میں روح پھونک دی ہے اس لئے یہ افسانچے بہت جلدی قاری کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے افسانچوں کا مجموعہ ''نقطۂ نوگریز'' (مطبوعہ ۲۰۰۹ء) اردو افسانچہ نگاری کی تاریخ میں بیش بہا اور گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ محترم نعیم کوثر نے تحریر فرمایا ہے کہ :

''خالدؔ عابدی کے افسانچے خاص طور پر موضوعِ بحث بننے لائق ہیں۔ ''نقطۂ نوگریز'' کی منی کہانیاں نہ صرف ادبی نزاکتوں کی سوجھ بوجھ کی عکاس ہیں بلکہ تاثرات کی گہرائیوں میں غرق کر دیتی ہیں اور قاری پر ایک لطیف سی کیفیت طاری کرتی ہیں۔ رفعت خیال اور حسن بیان مختصر ترین کہانیوں میں سمو دینا اعلیٰ تخلیقانہ فن کاری اور مشاہدات کی گہرائی کا بین ثبوت ہے۔ راقم الحروف کو خالد عابدی کی منی کہانیوں میں لفظی مصوری کا ادراک ہوتا ہے کہ کسی واقعہ یا موقع کی صحیح تصویر غیر مرئی رنگوں میں اُبھر آتی ہے۔''

عابدی صاحب کو ڈرامہ نگاری سے بھی گہری دلچسپی ہے، انہوں نے ریڈیو کی ملازمت کے دوران ریڈیو پروگرامز کی ضرورت کے مطابق ریڈیائی ڈرامے لکھے جو آل انڈیا ریڈیو کے پروگرامز میں نشر ہو کر سامعین کی توجہ کا مرکز بن سکے۔ ان کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ''آواز نما'' (مطبوعہ ۱۹۷۵ء) میں زیورطبع سے آراستہ ہوا۔ اسی طرح نونہالوں کی تعلیم و تربیت کے پیشِ نظر بھی انہوں نے ڈرامے تخلیق کیے جن کا مجموعہ ''ٹیچر کے بغیر'' (مطبوعہ ۱۹۹۴ء) شہرت کی معراج پر پہنچ چکا ہے۔ اس کی تصدیق کے لئے مشہور ڈرامہ نگار نیز ناقد ڈرامہ نگاری مرحوم ابراہیم یوسف کا یہ بیان وثوق سے خالی نہیں ہے کہ :

''...........''آواز نماز'' کے بارے میں یہ چند سطور لکھ کر مجھے خوشی ہو رہی ہے۔ اردو میں ڈراموں اور ریڈیائی ڈراموں کے مجموعے کم ہیں۔ اس لحاظ سے آواز نما اردو میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ ان ڈراموں کو پڑھ کر ضرور کہیں گے کہ ''خالد صاحب آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی'' اور یقیناً یہ خوشی نہ تو تکلفاً ہوگی اور نہ رسماً بلکہ حقیقی ہوگی۔''

ریڈیو سے وابستہ اکثر اردو ادیبوں اور شاعروں کی طنز و مزاح سے دلچسپی رہی ہے۔ پطرس بخاری کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ مضامین پطرس اسی دلچسپی کا ثمرہ ہیں۔ عابدی صاحب نے نہ صرف پطرس کی روایت کو زندہ رکھا بلکہ اُس میں اضافہ بھی کیا۔ ان کے کئی مضامین جو طنز و مزاح سے متعلق ہیں، معاصر رسائل و جرائد اور انتخابات میں شائع ہوئے اور آل انڈیا ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں سے نشر ہوئے۔ ان مضامین میں خاکہ نگاری، انشائیہ نگاری اور رپورتاژ نگاری کے عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اُن کی اس قسم کی تحریروں کا ایک مجموعہ بعنوان ''شکایتاً عرض ہے'' ۱۹۹۱ء میں منظر عام پر آ کر اپنا اثر دکھا چکا ہے۔ اس مجموعے کے مشمولات کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ عابدی صاحب کے طنز و مزاح میں بلا کا اعتدال موجود ہے۔ اُن کے یہاں چھینٹیں اڑا دینے والی ہنگامہ آرائی ہے اور نہ ہی بعض نام نہاد طنز و مزاح نگاروں جیسی سست اور سرد کیفیت۔ ایسے اہل قلم کی تحریروں کو نہ جانے کیوں طنز و مزاح کے زمرے میں شامل کر کے غلط روایت قائم کی جاتی رہی ہے۔ خیر عابدی صاحب اس طرح کی کمزوریوں سے ہمیشہ محفوظ رہے ہیں۔ اُن کی طنزیہ و مزاحیہ تحریروں میں ادبِ لطیف کے عمدہ نمونے موجود ہیں جو اپنا مخصوص مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔

ترتیب و تدوین اور تحقیق و تنقید بظاہر خشک موضوعات سمجھے جاتے ہیں۔ باذوق حضرات اس میدان میں قدم رکھنے سے ہچکچاتے ہیں۔ لیکن عابدی صاحب ایسے باذوق شخص ہیں جنہوں نے اپنے پُر اثر اسلوب کے سبب ترتیب و تدوین اور تحقیق و تنقید میں بھی اثر پذیری پیدا کر دی ہے۔ انہوں

نے ''باغِ فکر معروف بہ مقطعاتِ نسّاخ'' (مطبوعہ ۱۹۷۷ء) کی ترتیب وتدوین کا کارنامہ بحسن وخوبی انجام دے کر یہ ثابت کر دیا کہ یہ علم وفن مخصوص لوگوں کی جاگیر نہیں ہے۔ اگر کوئی بھی شخص محنتِ شاقہ اٹھا کر اس قسم کا کام کرے تو اس کام کی حیثیت مسلّم ہوگی۔ مرحومہ شفیقہ فرحت صاحبہ نے تحریر فرمایا ہے کہ :

''میں نے خالد صاحب کی کتاب ''نسّاخ'' کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ شاید خالد صاحب کے علاوہ کسی نے اتنی محنت کی ہو پھر مجھے اس سے بات چیت کرتے ہوئے معلوم نہ ہوا کہ وہ لکھنے پڑھنے کے معاملے میں مجنوں سے بھی زیادہ دیوانہ ہے (مجنوں گورکھپوری کی روح سے معذرت کے ساتھ) کاغذ کے ایک ایک پرزے کو چوم چوم کر آنکھوں سے لگا کر رکھتا ہے۔''

ترتیب وتدوین سے قطع نظر عابدی صاحب کے تحقیقی وتنقیدی مضامین ومقالات بھی اہلِ علم وادب کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ ہندوپاک کے مؤقر رسائل وجرائد میں اُن کے تحقیقی وتنقیدی مضامین ومقالات تزک واحتشام کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں جن کا ایک مجموعہ بعنوان ''مضامینِ خالد'' ۱۹۹۵ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ اس مجموعے میں ان کی بعض نمائندہ مضامین کو شاملِ اشاعت کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہنوز اُن کے متعدد تحقیقی وتنقیدی مضامین ومقالات معاصر رسائل وجرائد میں بکھرے پڑے ہیں۔ امید ہے کہ عابدی صاحب اُن گوہر ہائے آبدار کو بھی یکجا کر کے جلد ہی ایک لڑی میں پروئیں گے تاکہ علم وادب کے بعض تاریک گوشے روشن ہوسکیں۔

انٹرویو بہت مشکل فن ہے۔ اور اس کا مشکل کا سامنا انٹرویو لینے والے اور دینے والے دونوں کو کرنا پڑتا ہے۔ عابدی صاحب نے ہمیشہ چیلنجز کو قبول کیا ہے، اس کا بیّن ثبوت اس طرح فراہم ہوتا ہے کہ آپ نے بے شمار علمی وادبی شخصیات اور فلمی ہستیوں کے کثرت سے انٹرویوز لیے ہیں۔ عابدی صاحب کبھی انٹرویو دینے والی شخصیت پر حاوی ہونے کی کوشش نہیں کرتے، وہ بڑے مہذب ومؤدب طریقے سے انٹرویو لیتے ہیں اور ہمیشہ اس قسم کے سوالات پوچھتے ہیں جو کسی نہ کسی نوعیت سے کارآمد اور معلوماتی ہوتے ہیں نیز ان کا پہلو رجائی اور مثبت بھی ہوتا ہے۔ اگر عابدی صاحب کے ان معلومات افزا انٹرویو سے متعلق تفصیلات حاصل کرنی ہوں تو اُن کے انٹرویوز اور ملاقاتوں کے مجموعوں ''اردو انٹرویوز'' (مطبوعہ ۱۹۹۲ء) اور ''اردو مراسلاتی انٹرویو'' کا مطالعہ ناگزیر ہے جن میں عابدی کے وہ انٹرویو شامل ہیں جو انہوں نے اردو ادیبوں، شاعروں اور ہندوستان فلمی ہستیوں سے وقتاً فوقتاً لیے۔

فلم عابدی صاحب کا محبوب مشغلہ ہے۔ انہوں نے اپنی متعدد تحریروں میں اس امر کی غمازی کی ہے کہ اردو کی ہندوستانی فلم کو مقبولیت دلانے میں کلیدی حیثیت رہی ہے۔ وہ اس موضوع پر بقولِ خود ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن آپ کے استادِ محترم پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب نے اس موضوع کو پسند نہیں فرمایا۔ عابدی صاحب نے اردو اور فلم کے موضوع پر اگرچہ ڈاکٹریٹ نہ کی ہو لیکن ''ہماری فلمیں اور اردو'' کے زیرِ عنوان ۲۰۰۹ء میں ایک تحقیقی کتاب مرتب کی جس میں گیارہ مشاہیر کی ہندوستانی فلموں سے وابستگی پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کی ہر مکتبۂ فکر کے لوگوں نے خوب پذیرائی کی ہے۔ اس کا اندازہ ان تبصروں، مضامین اور تاثراتی خطوط سے ہوتا ہے جو اس کتاب کے متعلق لکھے گئے ہیں۔ چنانچہ محمد ایوب واقفؔ (ممبئی) لکھتے ہیں کہ ''ہماری فلمیں اور اردو'' میں کچھ ایسے عنوانات پر آپ نے خامہ فرسائی کی ہے جو اس وقت بھی نئے تھے جب آپ کے قلم کی جنبشوں سے یہ وجود میں آئے اور آج بھی اتنے ہی تازہ اور نئے ہیں۔ ان عنوانات پر ابھی تک بہت کم لوگوں نے لکھا ہے''۔

اسی سلسلے میں جناب رؤف خیر (حیدرآباد) نے تحریر فرمایا ہے کہ:

''ہماری فلموں میں جو کچھ ہوتا ہے وہ پردے کی زینت ہو کر سامنے آتا ہے۔ مگر بہت ساری باتیں ''پسِ پردہ'' ہوتی ہیں جن کی آپ نے

نشاندہی کی ہے۔آپ نے دلچسپ پیرائے میں معلومات بہم پہنچائی ہیں۔''

اردو خطوط نگاری کے سلسلے میں عابدی صاحب کا مطالعہ نہایت وسیع ہے اس کا سبب یہ ہے کہ جب آپ کے استاد محترم نے فلموں سے متعلق موضوع کو مسترد کیا تو انہیں ''بیسویں صدی میں اردو کا مکتوباتی ادب'' موضوع برائے پی ایچ ڈی تفویض کیا جس پر عابدی صاحب نے خوب محنت کی او رمطالعہ ومشاہدہ بھی کیا لیکن افسوس کہ اُن کا تمام تحقیقی اثاثہ ایک حادثے کی نذر ہو گیا اور انہیں ڈگری نہیں مل سکی۔اس کا قلق یا افسوس عابدی صاحب کے علاوہ ان کے اہلِ خانہ اور دوست احباب کو بھی ہے۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ عابدی صاحب کو ہندوستان کی کسی یونیورسٹی کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی سند عطا کرنا چاہئے کیونکہ ان کا مجموعی کام اسی کے لائق ہے۔افسوس کہ ماضی قریب میں بعض ایسے لوگوں کو ہندوستان کے باہر کی یونیورسٹیز نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی ہے جو محض پانچویں جماعت پاس جاہل ہیں اور رات کو گیارہ بجے بعد اہلِ علم وادب کو موبائل فون کر کے مجبور کرتے ہیں کہ پانچ ہزار روپیہ دیجئے، ہم اپنے رسالے میں آپ کا گوشہ نکالنا چاہتے ہیں۔ایسے مدیران کے رسائل بھی غیر معیاری ہیں اور محض ادبی بلیک میلنگ پر چل رہے ہیں۔اس قسم کے بعض جاہلوں کے خطوط میرے پاس کثرت سے موجود ہیں۔وہ یونیورسٹی اور کالج کے پروفیسرز کو لالچ دے کر مجبور کرتے ہیں کہ ہم پر آپ پی ایچ ڈی کرائیں گے،ہم آپ کا گوشہ نکالیں گے یا آپ پر کتابیں لکھوا کر شائع کرا دیں گے۔اس تفصیل کا مقصد صرف یہ ہے کہ عابدی صاحب اس قسم کے کم ظرف اور نااہلوں سے ہزار درجہ بہتر شخص ہیں۔جو اتنی ڈھیر سی کتابوں کے مصنف ہو کر بھی بڑی سادگی سے اپنا کام کر رہے ہیں۔اس لئے نہ صرف انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی جانی چاہئے بلکہ اُن پر بھی تحقیقی کام ہونا چاہئے۔

☆☆☆☆☆